بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تحریک ادب

شمارہ75، مارچ-2024 جلدنمبر 17

Tahreek-e-adab vol-17, issue-75, March 2024

مدیرEditor

جاویدانور(ڈاکٹر جاوید احمد) **Jawed Anwar** (Dr.Jawed Ahmad)

cell-0091-9935957330

مجلس ادارت

Editorial board and Peer Review committee

پروفیسر صغیر افراہیم، سابق صدر شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

Prof. Sagheer Afrahim Ex.Chairman Dept.of Urdu A.M.U.

پروفیسر شہاب عنایت ملک، سابق صدر شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی

Prof.Shohab Inayat Malik Ex.HOD Urdu,Jammu University

پروفیسر محفوظہ جان، صدر، شعبہ کشمیری، کشمیر یونیورسٹی

Prof. Mahfooza Jaan(H.O.D.Kashmiri,Kashmir University)

ڈاکٹر شمس کمال انجم، صدر شعبہ عربی، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی

Prof.Shahina Rizvi(Ex.HOD,Urdu,MKVP University,VNS.)

پروفیسر شاہینہ رضوی (سابق صدر، شعبہ اردو، مہاتما گاندھی کاشی ودیاپیٹھ یونیورسٹی، وارانسی)

Dr. Shams Kamal Anjum, H.O.D. Arabic, Baba Ghulam Shah Badshah University,Rajouri (J&K)

ڈاکٹر دبیر احمد، صدر شعبہ اردو، مولانا آزاد پی۔جی۔کالج، کولکاتا

Dr. Dabeer Ahmad,H.O.D.Urdu, Maulana Azad P.G. College,Kolkata

ڈاکٹر احسان حسن، شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی

Dr.Ehasan Hasan,Dept of Urdu BHU Varanasi

مجلس مشاورت

Advisery Board and Peer Review committee

نجمہ عثمان، پروفیسر عارفہ بشریٰ، رشید احمد، ڈاکٹر فروز حیدری،
عرفان عارف، ڈاکٹر چمن لال

Najma Usman(Surrey, United Kingdom)

Prof. Arifa Bushra(Dept. of Urdu,Kashmir University)

Rasheed Ahmad(Chairman Rosewood Academy,VNS

Irfan Arif(H.O.D.Dept. of Urdu,Govt.SPMR College of Commerce,Cluster University of Jammu,Jammu)

Dr.Chaman Lal Bhagat(Asst. Prof.Dept. of Urdu,Jammu University,Jammu)

Name Tahreek-e-Adab(Urdu Monthly)

ISSN 2322-0341

سال اشاعت: Year of Publication 2024 (جلد نمبر 17) Vol-17

شمارہ نمبر ،شمارہ 75۔مارچ، Issue November 2024

سرنامہ خطاط: انور جمال Title name Artist : Anwar Jamal, Varanasi

سرورق : عظمی اسکرین Title cover Uzma Screen, Varanasi

فی شمارہ : دوسو روپے 200/-Two Hundred rs. per copy

زرسالانہ : دو ہزار روپے (رسالہ صرف رجسٹرڈ ڈاک سے ہی بھیجا جائے گا)

Annual Membership 2000/- rs. two Thousand Rupees

تاعمر خریداری (ہند): بیس ہزار روپے

Life Time: 20000/- Twenty Thousand rs.(only india)

چیک یا ڈرافٹ اور انٹرنیٹ بینکنگ کے ذریعے زر رفاقت یہاں ارسال کریں۔

Please send your subscription amount or donation through cheque,draft or internet banking on the following:

Jawed Ahmad IFSC SBIN0005382 A/C no. 33803738087

State Bank Of India,Branch-Shopping centre(B.H.U.Campus.B.H.U.Varanasi-221005(U.P) India

اس شمارہ کی مشمولات میں اظہار کیے گئے خیالات ونظریات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

The content/idea expressed in any article of this journal is the sole responsibility of the concerned writer and this institution has nothing to do with it.

متنازعہ تحریر کے لیے صاحب قلم خود ذمہ دار ہے۔تحریک ادب سے متعلق کوئی بھی قانون چارہ جوئی صرف وارنسی کی عدالت میں ممکن ہوگی۔

Any legal matter pertaining to tahreek-e-adab will be possible only in the jurisdiction of Varanasi court.

جاوید انور مدیر تحریک ادب نے مہاویر پریس، وارانسی سے شائع کرار دو آشیانہ ۱۶۷، آفاق خان کا احاطہ، منڈواڈیہہ بازار، وارانسی سے تقسیم کیا۔

Jawed Anwar Editor Tahreek-e-Adab has got this journal published from mahavir press, Varanasi and distribute it from Urdu Ashiana,167 Afaq Khan Ka Ahata,Manduadeeh Bazar,Varanasi-221103

فہرست

1۔کیرالہ: ہندوستان میں اسلام کا پہلا مسکن	ڈاکٹر کے پی شمس الدین	5
2۔علاقہ ملابار میں اردو زبان کا فروغ	رشیدہ ایم	10
3۔آئی سی ٹی کے ذریعے اردو میڈیم اساتذہ کو بااختیار بنانا: مواقع اور چیلنجز	ڈاکٹر محمد سعادت حسین	13
4۔پہاڑی تہذیب وثقافت: ایک تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر آفتاب احمد شاہ	21
5۔بنگال کے افسانہ نگاروں پر ترقی پسند تحریک کے اثرات	نصیبہ خاتون	27
6۔مولانا ریاض الدین امجد ریاض	محمد یعسوب	33
7۔عہد سہیل میں اردو صحافت	سیمیں رخسار	37
8۔انٹرنیٹ: ایک جال	نیہار فیق	42
9۔ویتنام کی جنگ آزادی	راشدہ تسنیم	44
افسانے: 1۔نئی تصویر: وحشی سعید 2۔رشتے نئے پرانے: نورشاہ 3۔دوسرا شوہر: ڈاکٹر نذیر مشتاق 4۔کتا: پروفیسر فرخندہ ضمیر 5۔لوگوں کا کام ہے کہنا: حمیرہ سعید		45
6۔انجمن نصرت العاشقاں (انشائیہ)	کاچو اسفبد یار خاں	66
1۔تعلیم میں بلا کچین ٹیکنالاجی: کیا، کیوں اور کیسے؟	پروفیسر نوشاد حسین	70
2۔ابر ستم: ایک مطالعہ	ڈاکٹر محمد وسیم الدین	79
3۔اردو نظم کا رجحان: 1947 سے 60 تک	ڈاکٹر محمد مصطفیٰ	84
4۔اختر اورینوی کی ناول نگاری	محمد نعیم رضا	89
5۔جوگندر پال: ایک منفرد افسانہ نگار	محمد نورالہدیٰ	95
6۔علی گڑھ تحریک اور اردو ادب	عائشہ نسرین کے۔پی	100
7۔سید یوسف حسینی اور ان کے ہمعصر علماء وشعرا کا مختصر تعارف	اختر النساء	111
8۔معتمد خاں: عہد جہانگیر کا نامور ادیب ومورخ	راحلہ تبسم	114

9۔وحیدالدین سلیم پانی پتی: بحیثیت جید عالم وقومی شاعر ثمیرہ خانم 118
10۔ایک اہم رباعی گو: ابراہیم اشک عبدالقہار انجم 123
11۔شعبہ اردو مہیلا مہاودھیالیہ، بنارس ہندو یونیورسٹی میں (رپورٹ) 126

Kerala : The First Place of Islam in India by Dr. K.P. Shamuddin
Tirurkad (Malappuram,Kerala) cell-Phone: 09847422682
ڈاکٹر کے۔پی۔شمس الدین ترورکاڈ (ملاپورم، کیرالا)

کیرالا: ہندوستان میں اسلام کا پہلا مسکن

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سندھ میں محمد بن قاسم کے حملوں یا فتوحات سے ہوئی اور اسلام پھیلنے لگا۔اس طرح یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا،لیکن جب ہم محمد بن قاسم کی سندھ آمد کی وجوہات پر غور کرتے ہیں تو اس وقت کے یہاں کے راجہ داہر کا وہ رویہ جو انہوں نے عربی تاجروں کے جہازوں کو سمندری ڈاکوؤں کے ذریعہ ان کی ریاست کی سمندری سرحد کے اندر لوٹ لئے جانے کے بعد اس سلسلے میں اختیار کیا تھا،اس کے بارے میں غور کرنا ضروری ہے۔دوسری اہم بات یہ کہ اس وقت سندھ میں اسلام پھیلنے کو پورے ہندوستان میں اسلام پھیلنا نہیں مانا جاسکتا بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی اس جگہ سندھ میں اسلام محمد بن قاسم کی آمد کے بعد پھیلا ۔لیکن جہاں تک ہندوستان میں اسلام کی ابتداء کی بات ہے تو یہ شرف کیرالا ریاست کے ساحلی علاقے ملابار کو حاصل ہے۔دراصل پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے دور حیات ہی میں ہندوستان کے اس علاقہ میں مسلمانوں کی آمد اور اسلام کی تبلیغ شروع ہوچکی تھی،جس کا اہم مرکز جنوبی ہند کا ساحلی علاقہ 'ملابار' (کیرالا) تھا۔اس طرح کیرالا میں سب سے پہلے اسلام کی تبلیغ فتح سندھ کے بہت پہلے ہی ہو چکی تھی۔اور وہ بھی پُرامن طریقے سے۔

7 ہجری میں آپ ﷺ نے جب ساری دنیا کے راجا مہاراجا اور بادشاہوں کو دعوت اسلام کے خطوط ارسال کیے تو اس وقت آپ ﷺ مدینہ میں مقیم تھے۔ان دعوتی خطوط کے ارسال

کرنے سے پہلے ہی ملابار (کیرالا) کا راجا چیرامان پیرومال مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا۔ یہ چیرامان سلسلہ کا راجہ تھا جس کی حکومت عرصہء دراز سے اس علاقے میں تھی اور ہر ولی عہد جب بادشاہ بنتا تھا تو اسے چیرامان کہا جاتا ہے۔ جب کفار مکہ نے رسول ﷺ کے سامنے یہ شرط رکھی کہ اگر آپ ﷺ چاند کے دوٹکڑے کر دیں گے تو وہ سب ایمان لے آئیں گے تو رسول ﷺ کی انگلی کے اشارے سے اور اللہ کے حکم سے چاند دوٹکڑے ہو کر پھر جڑ گیا۔ جس کا ذکر قرآن میں موجود ہے، لیکن کفار مکہ نے اسے بھی نہ مانا اور یہ کہتے ہوئے ایمان لانے سے انکار کر دیا کہ یہ جادو ہے۔ چونکہ یہ واقعہ حقیقت تھا، اس لئے دنیا میں اور لوگوں نے بھی جو اس وقت ایسے ہی چاند کو دیکھ رہے تھے، اس کو دوٹکڑے ہوتے ہوئے اور دوبارہ اسے جڑتے ہوئے دیکھا۔ ظاہر ہے کہ یہ غیر متوقعہ تھا لہذا شاید بہت سے لوگوں نے اسے ایک بھرم سمجھا ہوگا۔ راجا چیرامن پیرومال بھی انہیں خوش قسمت لوگوں میں تھا جو اس وقت اپنے محل کی چھت پر بیٹھا اس وقت چاند کو ہی دیکھ رہا تھا اور راجا نے خود اپنی آنکھوں سے شق القمر کا معجزہ دیکھا۔ چونکہ اس کے نصیب میں ہدایت لکھی تھی، لہذا اس نے اس غیر متوقعہ واقعے کو اپنے اس روز نامچے میں درج کر لیا جس میں اس وقت کے چیرامان راجہ کوئی متوقعہ واقعہ یا کوئی حیرت انگیز بات یا بہت ضروری بات درج کرتے تھے۔

تاریخ سے ہمیں ان باتوں کی شواہد ملتی ہے کہ حضرت محمد ﷺ سے پہلے ہی عربوں کا تعلق کیرالا کے ساحلی علاقوں سے رہا ہے ہندوستان میں عربوں کے خاص تجارتی مراکز میں سے ایک اہم مرکز ملابار (کیرالا) تھا۔ اہل عرب یہاں کے گرم مسالے، تلوار، دوائیں، خوشبوجات وغیرہ لے جایا کرتے تھے۔ ملابار میں آکر تجارت کرنے کے لیے عربوں پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ یہاں عربوں کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ یہاں کے مقامی لوگ ان سے بہت ہی خلوص کے ساتھ پیش آتے اور یہاں کے ہندو راجا عربوں کو ہر طرح کی سہولیات بھی مہیّا کیا کراتے تھے۔

دنیا میں حضرت محمد ﷺ کی آمد اور اسلام کے ارتقا کے بعد ہندوستان کے ملابار میں عرب تاجر اور سیاح کے ذریعے اسلام کا تعارف اور چرچا ہونے لگا تھا۔ اسی دوران ۶۱۷ء میں معجزہ شق القمر کا واقعہ پیش آیا تھا اور اسی شق القمر کے معجزے کو راجا چیرامان پیرومال نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد اس عجیب واقعہ کے متعلق تحقیق و تفتیش شروع کی تو معلوم ہوا کہ عرب کے ملک میں ایک پیغمبر پیدا ہوئے ہیں۔ انہوں نے یہ معجزہ دکھایا ہے یہ سن کر راجا تخت اور سلطنت اپنے ولی عہد کے سپرد کر کے کچھ عرب تاجروں کے ساتھ جو تجارت کے بعد واپس جا رہے تھے، ان کے ساتھ ملک

عرب کو روانہ ہوا۔ راجا کا یہ سفر عام اطلاع کے بغیر پوشیدہ طور پر عمل میں آیا تھا۔

راجا نے مکہ شریف پہنچ کر آپ ﷺ سے ملاقات کی اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ 17 دنوں تک راجا آپ ﷺ کی خدمت میں مہمان بن کر رہے۔ بعد میں مزید اسلامی تعلیمات کے لیے پانچ سال مدینہ (یثرب) میں پھر مکہ میں دونوں شہروں میں کل دس سال سے زائد گزارے۔ بعد میں تبلیغ اسلام کو لے کر کئی ممالک کا دورہ کرنے کے بعد ہندوستان کے اتر پردیش میں کانپور کے قریب قنوج میں تشریف لائے۔ یہاں اسلام کی ترویج اور تبلیغ کرتے کئی عرصے گزارے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہیں راجا کا انتقال ہوا۔ یعنی وہ اپنی ہندوستان آمد کے بعد اپنی ریاست کیرالا نہ جا سکے اور نہ وہاں کے لوگوں کو ہی اس کی خبر ہوئی کہ راجا ہندوستان میں آ چکے ہیں۔

کچھ عرصہ بعد عربی اور عجمی مسلمان درویشوں کی ایک جماعت آدمؑ کے قدم مبارک کے نقش کی زیارت کے لیے سری لنکا جا رہے تھے۔ حدیثوں کے تفسیروں اور متعدد روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ جب آدمؑ کو جنت سے نکالا گیا تھا تو آپؑ نے ملابار کے قریبی جزیرہ سراندیپ (سری لنکا) میں اپنا پہلا قدم رکھا تھا۔ آپؑ کے قدم کا نشان آج بھی موجود ہے اور آج بھی آدم کی چوٹی کے نام سے یہ پہاڑ مشہور ہے۔ اسی پہاڑ کی زیارت کی غرض سے نکلے ہوئے درویشوں کی کشتی کو راستے میں طوفان سے دوچار ہونا پڑا، اسی لیے ان کو مجبوراً ملابار کی ساحل پر لنگر انداز ہونا پڑا تھا۔

طوفان کی زد میں آنے والے مسافروں کا حال سن کر ملابار کے راجا نے انہیں اپنے پاس بلایا اور ان کے مذہب 'اسلام' کے متعلق تفصیلات معلوم کی۔ راجا ان درویشوں کے ساتھ نہایت ہی حسن واخلاق اور تکریم و تعظیم کے ساتھ پیش آیا۔ امیر قافلہ نے جب راجا کو معجزہ شق القمر کی یاد دلاتے ہوئے ان کے پہلے کے چیرامن راجہ کا ذکر کرتے ہوئے مشرف بہ اسلام ہونے کی بات بتائی تو انہوں نے اس کا ثبوت اس روزنامچے میں تلاش کیا جس میں یہ واقعہ درج کرنے کی بات چیرامن راجہ نے عرب کے لوگوں کو بتائی تھی۔ وہ ثبوت تحریری دستاویز کی صورت میں موجود تھا۔ راجا نے سری لنکا سے واپسی پر اس کو بھی ساتھ لے جانے کی درخواست کی۔ قافلہ کے سری لنکا سے واپس آنے تک راجا نے اپنے ملک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے اپنے معتمد سرداروں کو تقسیم کر دیے۔ جو سردار سب سے زیادہ معتبر اور راجا کا رازدان تھا۔ اس کو اپنی سلطنت کا مہتمم اور بقیہ سرداروں کا سرپرست ونگران مقرر کیا۔ اور خود گوشہ نشین ہو کر اس قافلہ کی واپسی پر ان کے ساتھ ہو لیا۔

چنانچہ ۶۲۶ء میں عرب پہنچ کر راجا نے نبی ﷺ کے مبارک ہاتھوں پر اسلام قبول

کیا۔اس وقت آپ ﷺ کی عمر ۷۵ رسال کی تھی۔ پھر چند برسوں بعد راجا چند بزرگوں کے ساتھ ملابار واپس آنے کے لیے نکلا۔ ملک یمن کے ساحلی علاقہ شحر مغلّہ میں کچھ دن گزارے۔ طبیعت کی ناسازی کے سبب اس کو یہاں زیادہ دن رکنا پڑا۔طبیعت بد سے بدتر ہوگئی تو راجا نے ملابار جانے والے قافلہ کے شرف بن مالک، اُن کے ماموں مالک بن دینار اور ان کے بھتیجے مالک بن حبیب وغیرہ سے کہا کہ ''اس مرض میں میرے بچنے کے امکانات بہت کم ہے۔ میری موت واقع ہوگئی تو ملابار کا سفر ملتوی نا کرنا۔اس کے چند دنوں بعد ہی راجا انتقال کر گیا۔" عمان" کے صلالہ میں آج بھی ان کا مزار شریف دیکھا جا سکتا ہے۔ انتقال سے پہلے راجا نے قافلہ سے یہ بھی کہا تھا کہ ''میری بیماری یا موت کا تذکرہ وہاں کسی سے نہ کرنا اور تم سب جلد از جلد ملابار کے سفر میں نکلنا'' ملابار میں تبلیغ اسلام کے کام کو پوری طرح مستعدی اور وسیع پیمانے پر کرنا'' یہ کہہ کر اپنے ملابار سلطنت کے مہتمم کے نام ایک وصیت نامہ لکھ کر ان پردیسی درویشوں کے حوالے کیا جس میں لکھا تھا کہ ان درویشوں کو ہر قسم کی امداد بہم پہنچائی جائے۔ان کو اپنی عبادت گاہوں کے بنانے کی اجازت دی جائے۔ ان سے ایسا سلوک کیا جائے کہ ان کو ہماری سلطنت غیروں کا ملک محسوس نہ ہو۔

تو مالک بن دینار کا قافلہ ملابار کے لیے نکلا جس میں ۲۲ رعلماء شامل تھے۔ ملابار کے ساحلی علاقہ کوڈنگلور (ضلع ترمٹھور) میں اپنے جہاز کا لنگر لگایا اور یہاں کی سلطنت کے والی کو راجا کا خط دیا۔جس کے نتیجے میں مالک بن دینار کے قافلہ کو یہاں پر ہر طرح کی سہولتیں مہیّا کی گئیں۔ پھر سب سے پہلے کوڈنگلّور میں مالک بن دینار کے قافلے والوں نے ایک مسجد بنائی۔مسجد کی تعمیر کے لیے تمام ساز وسامان اور امداد راجا کے حکومت نے مہیّا کیے اس طرح ۶۲۹ء میں تعمیر کی گئی یہ مسجد ہندوستان کی پہلی مسجد ہے۔ جو آج چیرامان جمعہ مسجد کے نام سے مشہور ہے۔مسجد کے اندر عربی میں مسجد کی تعمیر کا سال ۵ ہجری کنندکیا گیا ہے۔

اس خبر کے عام ہونے کے بعد کہ بانا پیرومال کا یمن میں انتقال ہوگیا ہے اور وہ وہیں مدفون ہیں، کیرالا میں اس خاندان کی حکومت ختم ہوگئی، تقسیم شدہ وراثت میں الگ الگ لوگ حکومت کرنے لگے جن میں سب سے مشہور ملابار (کالی کٹ) کا راجا سامودری تھا جس کی نسل بہ نسل حکومت چلتی رہی۔ کنّور کی اس شاہی حکومت کی بنیاد اسلام پر تھی۔ سامودری بانا پیرومال کی بہن کا بیٹا تھا۔ یہ شاہی خاندان 'ارکّل خاندان' کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس خاندان سے ٹیپو سلطان کے فرزند کے رشتے کی بات بھی چلی تھی۔

چیرامان پیرومال راجا کا بھانجے نے ملابار میں مشرف بہ اسلام ہوکر 64 ھجری میں ملابار کے کنور صوبہ میں اسلامی حکومت قائم کی۔اس اولین مسلم راجا کا نام علی راجا تھا جوار کل علی راجا کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ کیرالا کا واحد مسلم سلطنت راجا تھا۔ چیرامان پیرومال راجا کا بیٹا اور ان کے وزیر اوڈاملا نائر اور اسی شاہی خاندان کے صوبہ کنور کے چراکل حکومت کی اہم شخصیات نے اسلام قبول کیا۔ ملابار سے سفر کرنے والے ابن بطوط نے اپنے سفر نامہ میں بھی اس خاندان کا تذکرہ کیا ہے۔

اس کے بعد کیرالا میں اسلام بہت تیزی سے پھیلا۔اسی دور میں کالی کٹ، کولّم، ایژی ملا، چالیام، کاسرگوڈ، پندلاینی، دھرمڈم، منگلور، شری کنڈ پور میں مساجد تعمیر کی گئیں۔ اسلام کی تبلیغ میں یہاں کے لوگوں نے کسی بھی طرح کا فرقہ وارانہ ماحول قائم ہونے نہیں دیا۔اور دنیا کی تمام جگہوں کی طرح یہاں بھی اسلام اپنی وحدانیت ،مساوات کے فلسفے اور اپنی تعلیمات کے ذریعہ یہاں کے باشندوں کے دلوں میں گھر کرتا گیا۔

کیرالا میں مسلمانوں کی آمد اور اشاعت اسلام کے متعلق اور بھی تحقیقات کی ضرورت ہے۔اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ جنوبی ہند کی تاریخ میں کیرالا کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔تنگ نظری اور عدم رواداری کے اس دور میں کیرالا کی مذہبی رواداری بہت ہی اہمیت رکھتی ہے۔

☆☆☆

ilaqa Malabaar mein Urdu Zaban ka Farogh by Rasheeda. M

رشیدہ ایم (ملاپورم، کیرالہ) Mallappuram, Kerala cell-9961000030

علاقہ ملابار میں اردو زبان کا فروغ

اردو زبان اپنی شیرینی کی وجہ سے آج سارے عالم پر چھائی ہوئی ہے۔ سرزمین ہند کی کوکھ سے پیدا ہوکر ساری دنیا کی چہیتی بیٹی بننے والی یہ زبان اپنی تہذیب، ثقافتی تمدّن سے ادیبوں اور قلم کاروں تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ عام لوگوں کے دلوں میں بھی گھر بسائی ہوئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہندوستان میں سب سے زیادہ بولی اور جانے والی زبان کو آج کچھ لوگ ہندی کے نام سے یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ کبھی اردو کا گہوارہ جانے والی ریاست اتر پردیش میں آج ہر جگہ یہاں تک کہ لکھنو میں بھی ہندی کے سائن بورڈ اور تختیاں دیکھتے ہیں۔ لیکن جنوبی ہند میں حالات کچھ اور ہیں۔ لوگ اردو کی جانب قدم بڑھا رہے ہیں۔ خاص طور پر کیرالا جیسی غیر اردو ریاست میں۔

جنوبی ہند میں کیرالا ایک ایسی ریاست ہے جہاں کے باشندوں کی بولی سمجھی لکھی اور پڑھی جانے والی زبان ملیالم ہے۔ کیرالا میں ہندو، مسلم، عیسائی، بدھ اور جین مذاہب کے لوگ یکسان طور پر ملیالم زبان استعمال کرتے ہیں۔ ایسی ریاست میں اردو زبان کی ترقی و ترویج بے شک ایک معجزہ ہی ہوسکتی ہے۔ علاقہ ملابار کیرالا کے ایک اہم صوبہ ہے۔ کیرالا میں اردو کی نشو ونما اور فروغ کے بارے میں اگر چرچا ہے تو علاقہ ملابار کا اہم خدمات کو سب سے اوّل سامنے رکھنا چاہیے۔ علاقہ ملابار میں اردو کی آمد صدیوں پہلے ہوئی ہے۔ یہاں سے اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لوگ دوسری ریاستوں میں جایا کرتے تھے۔ جب وہ پوری تعلیم پورا کر کے کیرالا تشریف لائے تو اردو بھی ساتھ لائے۔ اس طرح دینی مدرسوں اور مسجدوں میں عربی کے ساتھ ساتھ اردو کی بھی تعلیم دینے لگی۔ ان دنوں مسلمانوں کی تعلیم صرف دینی مدارس تک ہی محدود تھی۔ عام لوگ ملیالم زبان میں ضرور گفتگو کرتے تھے۔ لیکن لکھنے پڑھنے میں صرف دینی مدارس تک ہی محدود تھی۔ عام لوگ ملیالم بولی کو عربی رسم الخط میں لکھ کر بولتے تھے۔ اس طرح کی ایک زبان یہاں وجود میں آئی جسے عربی ملیالم کہتے ہیں۔

عربی ملیالم یہاں کے مسلمان اور باہر سے تعلیم حاصل کر کے آنے والے علماء و عرب کی ایجاد تھی۔ اس عربی رسم الخط والی ملیالم زبان میں اردو حروف بھی استعمال ہونے لگے۔ مثلاً:۔ 'پ'،

'ٹ'، 'چ'، 'ڈ' ان حروف کے استعمال کے ساتھ ساتھ اردو لفظ بھی ملیالم میں آنے لگے۔ مثلاً :۔ شیرینی، بندوبست، خوشی، بازار، سامان، ناشتہ، باقی، مٹھائی وغیرہ۔ صدیوں گزر جانے کے باوجود آج بھی ملیالم زبان پر اردو کا اثر باقی ہے۔" انقلاب زندہ باد" تحصیل دار، دھرنا، منصف۔ حوالہ وغیرہ الفاظ آج بھی ہر خاص اور عام ملیالم کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

ان حالات میں کرناٹک، اتّر پردیش، مہاراشٹرا وغیرہ ریاستوں سے تجارت اور سوداگری کے سلسلے میں لوگوں کی آمد و رفت شروع ہوگئی۔ یہاں انے والوں کی مادری زبان اردو تھی۔ ان کی صحبت سے کئی مقامات پر اردو کا چلن شروع ہوا۔ ان میں ضلع ملاپرم کے 'کوڈور' نام کا گاوں قابلِ ذکر ہے۔ یہاں بیس سال قبل تک بھی آگرہ سے کدّو کے لیے لوگ آئے تھے۔ کدّو سے وہاں کے مشہور مٹھائی پیٹھا بنایا جاتا ہے۔ کوڈور میں سبھی لوگ کدّو کی کاشت زیادہ کرتے تھے اور آگرہ میں بھی یہ گاوں مشہور تھا، سبھی یہیں آئے تھے۔ اس طرح کی میل ملاپ سے یہاں کے باشندوں کو اردو زبان سے واقفیت ہوگئی۔ اب یہاں کے لوگ بھی آپس میں اردو بولنے لگے۔ اس طرح یہ گاوں 'اردونگر' کے نام مشہور ہوگئے۔ یہاں کے مقامی اخبارات بھی اس گاوں کو اردونگر کے نام سے لکھنے لگے۔ آج ریاستِ کیرالا کے سب سے زیادہ اردو لکھنے پڑھنے اور بولنے والے اسی اردونگر سے تعلق رکھتے ہیں۔

کیرالا کے بابائے اردو سید محمد سرور صاحب اور ان کے رفقاء انجمن اشاعتِ اردو' قائم کیے۔ 1963 میں ولاپٹنم عبد اللہ صاحب نے "اردو پرچار سبھا' قائم کی۔ 1971ء میں کے۔ ٹی۔ سی ویران صاحب نے اردو پرچار سمتی' قائم کی۔ یہ تینوں تنظیمیں کالی کٹ میں قائم کیے تھے۔ 1972 میں ایس۔ ایم سرور صاحب کی سرپرستی میں ملاپرم اردو ڈولپمنٹ اسوسیشن' قائم کیا گیا۔ اس طرح تلشیری میں 1974 میں اسحاق فقیر صاحب نے انجمن اصلاح اللسان' تشکیل دی۔ یہ تمام تنظیمیں اپنے اپنے طرز و انداز میں اردو کی خدمات انجام دیتے ہوئے اس زبان کی ترقی و ترویج میں پیش پیش رہیا و راس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کیرالا کے عموماً ملبار کے سرکار اسکولوں میں اردو تعلیم عام ہونے لگی۔ ملبار اسکولوں میں جب اردو تعلیم کا آغاز ہوا اس وقت ریاستی تعلیمی بورڈ کی مرتب کردہ کوئی اردو درسی کتاب موجود نہیں تھی۔ آندھرا پردیش اور تمل ناڈو کی پہلی سے پانچویں جماعت تک کی اردو درسی کتابیں کیرالا میں پانچویں سے دسویں جماعت تک پڑھائی جاتی تھیں۔ اساتذہ کی رہنمائی کے لیے ٹیچر ٹیکسٹ کے نام سے بھی کتابیں تیار کی جاتی ہے۔ ان کتابوں کی تیاری میں کیرلا کے اردو اساتذہ کے علاوہ بیرون کیرالا سے ماہرانِ اردو اور ماہرانِ تعلیم کے اعلی شخصیات بھی حصّہ لیتے ہیں۔

ملابار میں بہت سے کالجوں میں اردو کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ ان کالجوں میں اردو کے مختلف پروگرام اور سیمینار منعقد کیے جاتے ہیں۔ 1972 میں قائم کردہ گونمنٹ کالج ملاپرم میں 1974 کو آل انڈیا یونیورسٹی اردو ٹیچرس اسوسیشن کی سالانہ کانفرنس بھی منعقد کی گئی تھی۔ اس وقت یہاں آل انڈیا مشاعرہ بھی ہوا تھا۔ گرنمنٹ کالج ملاپرم، گونمنٹ برنین کالج تلشیری، شری شنکراچاریہ یونیورسٹی کے علاقائی مرکز کوئلانڈی، فاروق کالج کالی کٹ اور سرسیّد کالج تلی پرمپا میں وقتاً فوقتاً اردو سیمینار اور غزل پروگرام بھی منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ 2012 میں قائم کیے گئے گونمنٹ کالج کونڈوٹی میں بی۔اے اردو ڈگری کورس کی حیثیت سے، گونمنٹ کالج منکڈا اور گونمنٹ کالج کوڈوولی میں اردو زبانِ ثانی کی حیثیت سے تعلیم حاصل کرنے کی سہولت مہیا کی گئی۔ 2013 میں قائم کردہ گونمنٹ کالج نمکلم اور 2014 میں قائم کیے گئے گونمنٹ ومنس کالج ملاپرم میں بھی اردو سیکینڈ لینگویج کی حیثیت سے تعلیم حاصل کرنے کی سہولت مہیا کی گئی ہے۔ 28 فروری 2011 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ملاپرم آف کامپس قائم کیا گیا۔ یونیورسٹی سطح پر شری شنکراچاریہ سانسکرت یونیورسٹی کالج کوئیلانڈی میں ایم۔اے، ایم فل اور پی۔ایچ۔ڈی کی سہولت مہیا ہیں۔ کنور یونیورسٹی میں بھی پی۔ایچ۔ڈی کرنے کی سہولت مہیا ہیں۔ کالی کٹ یونیورسٹی میں اردو ادیب فاضل اور ایم۔اے اردو جیسے کورس منعقد کیے جا رہے ہیں۔

حیدرآباد کے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا اسٹڈی سینٹر بھی کیرالا میں موجود ہے۔ ملابار کے کالی کٹ، ملاپرم، کاسرکوڈ اضلاع میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اردو کمپیوٹر سینٹر موجود ہیں۔ جہاں سے نوجوان طبقہ اردو ڈی۔ٹی۔پی سیکھ کر فارغ ہو رہے ہیں۔ NCPUL کی مرکزی کمیٹی میں پروفیسر کے۔ آلی کٹی مسلیار، ڈاکٹر حسین مڈوور، ڈاکٹر حکیم ازہری جیسے شخصیات ملابار کے نمائندے کی حیثیت سے ممبر بن چکے ہیں۔ 1991 میں کالی کٹ کے بیاپارا بھون میں منعقد محبانِ اردو کے اجلاس میں انجمن ترقی اردو کیرالا شاخ از سرِ نو تشکیل ہوئی۔ ماشاءاللہ اس وقت ملابار میں اردو کے قلم کار، شاعر، مصنف، محققین وغیرہ کی تعداد اچھی خاص ہیں۔ اردو میں ڈاکٹریٹ حاصل کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہیں۔ ملابار میں اردو کی خدمات انجام دینے کے لیے نوجوان طبقے کے لوگ جوش وخروش کے ساتھ آگے آ رہے ہیں۔ یہاں اردو کی صورتِ حال یہی رہی تو انشاءاللہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ مستقبل میں ضرور ریاستِ کیرالا بھی دوسری ریاستوں کے شانہ بہ شانہ کھڑی ہوجائے گی۔ ☆☆☆

ICT ke zariye Urdu medium Asatazah ko baa-ekhtiyar banana :
Mawaqe aur challenges by Dr. Md. Saadat Hussain (Patna)

ڈاکٹر محمد سعادت حسین (پٹنہ) cell-9507358960

آئی سی ٹی کے ذریعے اردو میڈیم اساتذہ کو بااختیار بنانا: مواقع اور چیلنجز

تعارف:

ٹیکنالوجی ہمیشہ متبدل حالت میں رہتی ہے(Koehler & Mishra, 2009) اور ہمیشہ یہ اپنی سابقہ حالت سے اگلی حالت میں منتقل ہوتی رہتی ہے(Zaidi & Hussain, 2023)۔اس کی تیز رفتار ترقی کے ساتھ، ڈیجیٹل تقسیم کو ختم کرنے اور اردو طلباء کے لیے معیاری تعلیم کو یقینی بنانے کے لیے اساتذہ کو ضروری آئی سی ٹی آلات اور تربیت سے آراستہ کرنا ضروری ہو گیا ہے(Kadir,2017)۔اردو ہندوستان کی دیگر زبانوں میں ایک امتیازی زبان ہے۔تاہم، جدید تدریسی وسائل اور پیشہ ورانہ ترقی کے مواقع تک محدود رسائی کی وجہ سے اردو میڈیم کے اساتذہ کو اکثر بدلتے ہوئے تعلیمی منظر نامے کو برقرار رکھنے میں متعدد دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اردو میڈیم کمرہ جماعت میں اساتذہ کو ان کے تدریسی طریقوں کو بہتر کرنے اور طلباء کو مؤثر طریقے سے محرک رکھنے کے لیے آئی سی ٹی آلات اور تکنیک فراہم کر کے بااختیار بنایا جا سکتا ہے۔آئی سی ٹی کا استعمال کرنے کے مختلف فوائد ہیں، جیسے آن لائن وسائل کی ایک وسیع رینج تک رسائی، انٹرایکٹو تدریسی مواد، ملٹی میڈیا مواد، اور باہمی تعاون کے ساتھ سیکھنے والے پلیٹ فارم۔ان وسائل کا استعمال کر کے، اساتذہ طفل مرکوز آموزش کو دلچسپ بنا سکتے ہیں، جس سے طلباء میں تنقیدی فکر، تخلیقی صلاحیتوں اور مسائل کو حل کرنے کی مہارتوں کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔اس کے علاوہ روایتی تدریسی طریقوں کی رکاوٹوں کو دور کرنے اور وسیع تر آبادی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے آئی سی ٹی کے ذریعہ اردو میڈیم اساتذہ کو بااختیار بنایا جا سکتا ہے۔جدید آن لائن پلیٹ فارم اور ڈیجیٹل آلات، اشتراکی اکتساب، برقیاتی اکتساب، مجازی کمرہ جماعت وغیرہ تک رسائی کے مواقع اساتذہ کے علم و مہارت کو بڑھا سکتے ہیں(Hussain,2016)۔حکومتی اداروں، تعلیمی اداروں، اور نجی شعبے کی تنظیموں کے درمیان باہمی تعاون کی کوششیں ایک بہتر ماحول بنانے کے لیے ضروری قدم ہے جو اردو

میڈیم کی تعلیم میں آئی سی ٹی کے استعمال کو فروغ دیتا ہے۔ اساتذہ کو اپنے کمرہ جاعت میں مؤثر طریقے سے آئی سی ٹی کو انٹیگریٹ کے قابل بنانے کے لیے مناسب ساز وسامان، تربیتی پروگرام، اور سپورٹ سسٹم قائم کیے جانے کی ضرورت ہے۔ اس سے نہ صرف اردو میڈیم اسکولوں میں تعلیم کے معیار میں اضافہ ہوگا بلکہ طلباء کی مجموعی ترقی اور کامیابی میں بھی مدد ملے گی، انہیں ڈیجیٹل دور میں پھلنے پھولنے کے لیے ضروری مہارتوں سے آراستہ کیا جائے گا۔

آئی سی ٹی کیا ہے؟ انفارمیشن اینڈ کمیونیکیشن ٹیکنالوجی (آئی سی ٹی) کا ظہور جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے شاندار تحفوں میں ایک ہے جس نے ہماری زندگی کے شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جس کو متاثر نہیں کیا ہو۔ آئی سی ٹی سے مراد ٹیکنالوجی اور آلات کی وسیع رسائی ہے جو معلومات کے حصول، پروسیسنگ، ذخیرہ کرنے اور ترسیل میں سہولت فراہم کرتی ہے۔ اس میں ہارڈ ویئر اور سافٹ ویئر کے اجزاء کے ساتھ ساتھ نیٹ ورکس اور کمیونیکیشن سسٹم بھی شامل ہیں۔ اپنے ظہور سے نہایت ہی کم وقت میں اس نے ہماری زندگی کو بہتر بنانے کے لیے نمایا کردار ادا کرتا آ رہا ہے۔ اس کے اطلاق نے ہماری زندگی میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ آئی سی ٹی جدید معاشرے کا ایک لازمی حصہ بن چکا ہے، جس نے تعلیم، کاروبار، صحت کی دیکھ بھال، مواصلات اور تفریح سمیت مختلف شعبوں پر گہرا اثر ڈالا ہے (Bosamia, 2013)۔

UNESCO(2009) کے مطابق، انفارمیشن اینڈ کمیونیکیشن ٹیکنالوجیز (ICT) کی تعریف "معلومات کی ترسیل، ذخیرہ، تخلیق، اشتراک یا تبادلہ کرنے کے لیے استعمال ہونے والے تکنیکی آلات اور وسائل کے متنوع سیٹ کے طور پر کی گئی ہے۔ ان تکنیکی آلات اور وسائل میں کمپیوٹر، انٹرنیٹ (ویب سائٹس، بلاگ اور ای میل)، براہ راست براڈ کاسٹنگ ٹیکنالوجی (ریڈیو، ٹیلی ویژن اور ویب کاسٹنگ)، ریکارڈ شدہ نشریاتی ٹیکنالوجی (پوڈ کاسٹنگ، آڈیو اور ویڈیو پلیئر اور اسٹوریج ڈیوائس) اور ٹیلی فون (فکسڈ یا موبائل، سیٹلائٹ، ویڈیو کانفرنسنگ وغیرہ) شامل ہیں۔

تعلیم میں آئی سی ٹی: تعلیم کے میدان میں، آئی سی ٹی نے علم کی فراہمی، حصول اور اشتراک کے طریقے کو تبدیل کر دیا ہے۔ اس نے تدریسی طریقوں میں انقلاب پیدا کیا ہے، تعلیمی وسائل تک رسائی کو بڑھایا ہے، اور سیکھنے کے مجموعی تجربے کو بڑھایا ہے (Ghavifekr & Rosdy, 2015)۔ تعلیم میں آئی سی ٹی کے کچھ اہم پہلو اور فوائد مندرجہ ذیل ہیں:

آئی سی ٹی کی مدد سے تعلیمی وسائل کی وسیع مقدار تک رسائی نہایت ہی آسان ہو گئی

ہے(Chakma,2022)۔انٹرنیٹ پر علم کا ذخیرہ ہے جس سے طلباء و اساتذہ وسیع پیمانے پر تعلیمی ذرائع تک پہنچنے، تحقیق کرنے، research repository، آن لائن جرنل، آن لائن لائبریری اور دوسرے ذرائع تک پہنچ کر اپنے علم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔معلومات کی یہ دستیابی یقینی بناتی ہے کہ آموزشی عمل صرف روایتی طریقہ جیسے کمرہ جماعت تک ہی محدود نہیں ہے۔آئی سی ٹی اکتساب کے عمل کو انٹریکٹیو اور دلچسپ بناتا ہے۔ڈیجیٹل آلات جیسے Smart Board، ملٹی میڈیا پریزنٹیشن، مصنوعی ذہانت، جدید تعلیمی سافٹ وئیر اساتذہ کو بصری طور پر خوبصورت اور انٹریکٹیو انداز میں مواد کو پیش کرنے میں نمایا کردار ادا کرتا ہے(Schrum, et al, 2007; Sweeder & Bednar, 2001)۔یہ فعال شراکت کو فروغ دیتا ہے، فہم میں اضافہ کرتا ہے اور اکتساب کو لمبے وقت تک ذہن نشیں رکھنے میں مدد گار ہے۔انسان نفسیاتی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہے۔اور ظاہر ہے کہ ان کے آموزش کا عمل بھی ایک دوسرے سے الگ ہی ہے۔ICT طلباء کی انفرادی ضروریات کے مطابق ذاتی نوعیت کے سیکھنے کے تجربات کو قابل بناتا ہے۔لرننگ مینجمنٹ سسٹم اور آن لائن پلیٹ فارم آموزگار کو لرننگ ماڈیول فراہم کرتے ہیں، جہاں طلباء اپنی رفتار سے آگے بڑھ سکتے ہیں، ذاتی رائے حاصل کر سکتے ہیں، اور اضافی اکتسابی وسائل تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ نقطہ نظر متنوع سیکھنے کے طریقہ کو فروغ دیتا ہے۔آئی سی ٹی صارفین کے درمیان تعاون اور مواصلات کی سہولت فراہم کرتا ہے۔آن لائن ڈسکشن فورم، ویڈیو کانفرنسنگ، اور باہمی تعاون کے آلات جغرافیائی حدود سے باہر، ہموار مواصلات اور خیالات کے اشتراک کو قابل بناتے ہیں۔ یہ باہمی سیکھنے، ٹیم ورک، اور نقطہ نظر کے تبادلے کو فروغ دیتا ہے، تنقیدی سوچ اور مسئلہ حل کرنے کی قابلیت کو بڑھاتا ہے۔آئی سی ٹی ملٹی میڈیا آلات کو اکتساب کے عمل میں انضمام کے قابل بناتا ہے۔

یہ ملٹی میڈیا وسائل سیکھنے کی مختلف ترجیحات کو پورا کرتے ہیں اور پیچیدہ تصورات کو مزید قابل رسائی اور دلکش بناتے ہیں۔ ورچوئل سمولیشن وغیرہ عمیق تجربات فراہم کرتے ہیں، جو طلباء کو تجریدی تصورات کو سمجھنے کے قابل بناتے ہیں۔آئی سی ٹی تشخیص اور تاثرات کے لیے مختلف آلات فراہم کرتا ہے۔آن لائن کوئز، انٹرایکٹو تشخیص، اور خودکار درجہ بندی کے نظام تشخیص کے عمل کو ہموار کرتے ہیں اور طلباء کو فوری تاثرات فراہم کرتے ہیں(Shukla, 2023)۔ یہ پیش رفت کی مسلسل نگرانی، سیکھنے کے خلاء کی نشاندہی، اور طالب علم کے آموزش میں مدد کے لیے ہدفی مداخلتوں کی اجازت دیتا ہے۔آموزگار کی مختلف ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے آئی سی ٹی نے نمایا کردار ادا کیا

ہے جس سے تعلیم کو ان افراد کے لیے قابل رسائی بنایا گیا ہے جو روایتی کمرہ جماعت میں شرکت سے قاصر ہیں (Chakma,2022)۔ آن لائن کورس، ویبنار، اور ورچوئل کلاس روم طلباء کو جغرافیائی رکاوٹوں کو ختم کرتے ہوئے فاصلاتی طور پر سیکھنے کی سرگرمیوں میں مشغول ہونے کے قابل بناتے ہیں۔ آئی سی ٹی فاصلاتی تعلیم میں face-to-face مواصلات کو ممکن بناتا ہے اور معلومات کے اشتراک اور اکتساب کو زیادہ موثر بناتا ہے۔ آئی سی ٹی مواد کا ذخیرہ تیار کرنے اور ان کا تجزیہ کرنا آسان بناتا ہے۔ آئی سی ٹی کی مدد سے مواد کے ذخیرہ کو حفاظت کے ساتھ جمع کیا جا سکتا ہے۔ ان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ آسانی کے ساتھ منتقل کیا جا سکتا ہے۔ مواد کا تجزیہ کرنے کے لیے محققین مواد اکٹھا کرنے، شماریاتی تجزیہ کے لیے ڈیجیٹل آلات اور سافٹ ویئر کا استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ فیصلہ سازی میں مدد کرتا ہے، طلباء کی کارکردگی میں رجحانات اور نمونوں کی نشاندہی کرتا ہے، اور موثر تعلیمی پالیسیوں اور طریقوں کی ترقی سے آگاہ کرتا ہے۔ عالم گیریت کی وجہ سے پوری دنیا ایک گاوں کی طرح ہوگئی ہے۔ ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک میں آسانی کے ساتھ جا سکتے ہیں۔ آئی سی ٹی دنیا بھر میں طلباء اور اساتذہ کے درمیان عالمی تعاون اور ثقافتی تبادلے کو فروغ دیتا ہے۔ آن لائن پلیٹ فارم کے ذریعے، طلباء پراجیکٹ میں تعاون کر سکتے ہیں، ثقافتی مباحثوں میں حصہ لے سکتے ہیں، اور مختلف نقطہ نظر اور ثقافتوں کے بارے میں بصیرت حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ عالمی شہریت، بین الثقافتی تفہیم کو فروغ دیتا ہے، اور طلباء کو باہم مربوط دنیا کے لیے تیار کرتا ہے۔ آئی سی ٹی اساتذہ کے لیے مسلسل پیشہ ورانہ ترقی کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ آن لائن کورس، ویبنار، اور تعلیمی پلیٹ فارم وسائل، بہترین طریقوں اور جدید تدریسی طریقوں تک رسائی فراہم کرتے ہیں۔ معلمین اپنی صلاحیتوں کو بڑھا سکتے ہیں، تازہ ترین تعلیمی رجحانات کے ساتھ خود کو متحرک رکھ سکتے ہیں، اور ماہرین تعلیم کی عالمی برادری سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔

اردو میڈیم اساتذہ کے لیے آئی سی ٹی میں مواقع: اردو میڈیم اساتذہ کے لیے آئی سی ٹی میں مواقع بہت زیادہ ہیں اور ان کے تدریسی طریقوں اور پیشہ ورانہ ترقی کو نمایاں طور پر بڑھا سکتے ہیں۔ اردو میڈیم اساتذہ کے لیے آئی سی ٹی میں چند اہم مواقع شامل ہیں: آئی سی ٹی اردو میڈیم اساتذہ کو آن لائن تعلیمی وسائل کی ایک وسیع رینج تک رسائی فراہم کرتا ہے، جیسے ای بک، انٹرایکٹو لرننگ ماڈیول، ویڈیو ٹیوٹوریل، اور تعلیمی ویب سائٹس۔ یہ وسائل اردو میڈیم کے تدریسی مواد کی محدود دستیابی کو دور کر سکتے ہیں، اساتذہ کو اپنے اسباق کو بڑھانے اور طلباء کو مزید متنوع اور دلکش مواد فراہم کرنے کے قابل

بنا سکتے ہیں۔آئی سی ٹی متعدد انٹرا ایکٹو ٹیچنگ ٹول پیش کرتا ہے جنہیں اردو میڈیم کے اساتذہ متحرک اور دلکش سیکھنے کے تجربات تخلیق کرنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ پریزنٹیشن سافٹ ویئر، انٹرا ایکٹو وائٹ بورڈ، تعلیمی ایپلیکیشن، اور ورچوئل سمولیشن اساتذہ کو پیچیدہ تصورات کو بصری طور پر دلکش اور متعامل انداز میں پیش کرنے کی اجازت دیتے ہیں، جس سے طلباء کے لیے سیکھنے کو مزید پر لطف اور موثر بنایا جاتا ہے۔آئی سی ٹی اردو میڈیم اساتذہ کو ڈیجیٹل اسسمنٹ اور فیڈ بیک کے آلات فراہم کرتا ہے، جس سے تشخیص کے عمل کو آسان بنایا جاتا ہے۔آن لائن کوئز، فارمیٹو تشخیص ایپلیکیشن، اور لرننگ مینجمنٹ سسٹم اساتذہ کو طالب علم کی پیشرفت کو ٹریک کرنے، بہتری کے شعبوں کی نشاندہی کرنے، اور بروقت فیڈ بیک فراہم کرنے کے قابل بناتے ہیں، جس سے مجموعی طور پر سیکھنے کے تجربے میں اضافہ ہوتا ہے۔آئی سی ٹی اردو میڈیم اساتذہ کے درمیان آن لائن تعاون کی سہولت فراہم کرتا ہے، جس سے وہ دنیا بھر کے اساتذہ سے رابطہ قائم کرنے، بہترین طریقوں کا اشتراک کرنے اور پیشہ ورانہ ترقی کی سرگرمیوں میں مشغول ہو سکتے ہیں۔آن لائن فورم، ویبینار، اور سوشل میڈیا پلیٹ فارم باہمی تعاون کے ساتھ سیکھنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں، جس سے اساتذہ کو جدید ترین تدریسی طریقہ کار اور تعلیمی رجحانات کے ساتھ اپ ڈیٹ رہنے کا موقع ملتا ہے۔

آئی سی ٹی اردو میڈیم کے اساتذہ کو آن لائن سیکھنے کے اجزاء کے ساتھ روائتی face to face کی ہدایات کو یکجا کرتے ہوئے blended learning کے طریقوں کو اپنانے کی اجازت دیتا ہے۔ یہ نقطہ نظر ذاتی نوعیت کے آموزش کے تجربات فراہم کر سکتا ہے، آموزش کے مختلف انداز کو ایڈجسٹ کر سکتا ہے۔آئی سی ٹی کو ان کے تدریسی طریقوں میں ضم کر کے، اردو میڈیم کے اساتذہ طلباء کو ڈیجیٹل بیداری کی ضروری مہارتوں کو فروغ دینے میں مدد کر سکتے ہیں۔ان مہارتوں میں معلوماتی بیداری، میڈیا کی بیداری، تنقیدی سوچ، اور آن لائن سیکیورٹی شامل ہیں، جو طلباء کو ڈیجیٹل دنیا میں مؤثر طریقے سے جانے کے لیے تیار کرتے ہیں۔آئی سی ٹی کے آلات اردو میڈیم کے اساتذہ اور طلباء کے لیے زبان کے فرق کو کم کرنے میں مدد کر سکتے ہیں۔ترجمہ سافٹ ویئر، زبان سیکھنے کے ایپلیکیشن، اور آن لائن زبان کے وسائل انگریزی زبان کی مہارت کو بہتر بنانے میں مدد کر سکتے ہیں، اردو میڈیم کے طلباء کے لیے تعلیمی مواد اور وسائل کی وسیع رینج تک رسائی کے مواقع فراہم کر سکتے ہیں۔

اردو میڈیم اساتذہ کے لیے آئی سی ٹی میں چیلنجز: جہاں آئی سی ٹی اردو میڈیم اساتذہ کے لیے بے

شمار مواقع فراہم کرتا ہے، وہیں انھیں اپنے تدریسی طریقوں میں ٹیکنالوجی کو مؤثر طریقے سے استعمال کرنے میں کئی چیلنجز کا بھی سامنا ہے۔ اردو میڈیم اساتذہ کے لیے آئی سی ٹی میں چند اہم چیلنجز میں شامل ہیں۔ اردو میڈیم اساتذہ کو آئی سی ٹی ٹولز اور وسائل جو بنیادی طور پر انگریزی میں دستیاب ہیں استعمال کرتے وقت زبان کی رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔ اردو میں مقامی مواد اور سافٹ ویئر کی کمی اساتذہ کے لیے نصاب اور اپنے طلباء کی لسانی ضروریات کے مطابق موزوں وسائل تلاش کرنا مشکل بنا سکتی ہے۔

بہت سے اردو میڈیم اسکول، خاص طور پر دیہی و پسماندہ علاقوں میں، مناسب آئی سی ٹی آلات و حربہ کی کمی ہے۔ بجلی کی کمی، ناکافی یا پرانا ہارڈ ویئر، ناقابل بھروسہ انٹرنیٹ کنیکٹیویٹی، اور کمپیوٹر یا آلات تک محدود رسائی کلاس روم میں ٹیکنالوجی کے مؤثر انضمام میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔ اردو میڈیم کے اساتذہ کے پاس محدود تکنیکی مہارت، محدود آئی سی ٹی آلات اور ایپلی کیشن سے واقفیت کی کمی ہوسکتی ہے۔ تربیت کے مواقع کی کمی یا آئی سی ٹی پر مرکوز پیشہ ورانہ ترقی کے پروگرام اساتذہ کے تدریسی طریقوں میں مؤثر طریقے سے آی سی ٹی کو انٹیگریٹ کرنے کی صلاحیت میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ جب بات آئی سی ٹی آلات اور مواد کو حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی ہوتی ہے تب اردو میڈیم کے اساتذہ کو اکثر وسائل کی قلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سافٹ ویئر لائسنس خریدنا، سیکھنے کے ڈیجیٹل وسائل حاصل کرنا، یا پریمیم تعلیمی پلیٹ فارم تک رسائی حاصل کرنا محدود بجٹ والے اسکولوں اور اساتذہ کے لیے مالی طور پر مشکل ہوسکتا ہے۔

اردو میڈیم اساتذہ یا اسکول کے منتظمین میں تبدیلی کی مزاحمت آئی سی ٹی کے موثر نفاذ میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔ روایتی تدریسی طریقے اور تعلیم میں ٹیکنالوجی کے فوائد کے بارے میں آگاہی کی کمی کے نتیجے میں آئی سی ٹی کے نئے طریقوں اور حکمت عملیوں کو اپنانے میں ہچکچاہٹ ہوسکتی ہے۔ آئی سی ٹی کو تدریس میں انٹیگریٹ کرنے کے لیے محتاط منصوبہ بندی اور نصاب کے مقاصد کے ساتھ ہم آہنگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اردو میڈیم کے اساتذہ اپنے تدریسی طریقوں میں بغیر کسی رکاوٹ کے ٹیکنالوجی کو شامل کرنے کے لیے جدوجہد کر سکتے ہیں، جس کے نتیجے میں سطحی انضمام ہوتا ہے جو سیکھنے کے نتائج کو بڑھانے کے لیے آئی سی ٹی کی صلاحیت سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھاتا ہے۔

سماجی و اقتصادی تفاوت اور ٹیکنالوجی تک غیر مساوی رسائی اردو میڈیم طلباء کے درمیان ڈیجیٹل تقسیم میں اضافہ کرسکتی ہے۔ گھر پر آلات یا انٹرنیٹ تک محدود رسائی طلباء کی آئی سی ٹی سے

چلنے والے سیکھنے کے تجربات کے ساتھ مکمل طور پر مشغول ہونے کی صلاحیت کو روک سکتی ہے، جس سے ان کے مجموعی سیکھنے کے نتائج متاثر ہوتے ہیں۔ اخیر میں، اردو میڈیم اساتذہ کے لیے آئی سی ٹی میں مواقع وسیع ہیں اور انھیں اعلیٰ معیار کی تعلیم فراہم کرنے، طلبہ کو مؤثر طریقے سے مشغول کرنے، اور اپنی پیشہ ورانہ ترقی کو بڑھانے کے لیے بااختیار بنا سکتے ہیں۔ آئی سی ٹی کو اپنانے سے، اردو میڈیم کے اساتذہ ان چیلنجوں پر قابو پا سکتے ہیں جن کا انہیں سامنا ہے اور سیکھنے کا ایک سازگار ماحول پیدا ہو سکتا ہے جو طلباء کو ڈیجیٹل دور میں کامیابی کے لیے تیار کرتا ہے۔

حوالہ:

UNESCO (2009), Guide to measuring information and communication technologies (ICT) in Education. Retrieved on 18th March, 2023 from https://uis.unesco.org/sites/default/files/documents/guide-to-measuring-information-and-communication

Bosamia, M. (2013), "Positive and negative impacts of information and communication technology in our everyday life"

Ghavifekr, S. & Rosdy, W.A.W. (2015). Teaching and learning with technology: Effectiveness of ICT integration in schools. International Journal of Research in Education and Science (IJRES), 1(2), 175-191.

Kadir, A. (2017) School education and use of ICT: A case study of an Urdu medium school located in central dist. of Delhi. TechnoLearn: An International Journal of Educational Technology, 1-10, June & December.

Chakma, D. (2022). Significance of ICT in Distance Education. Retrieved from https://onlinenotebank.wordpress.com/2022/01/15/significance-of-ict-in-distance-education/

Zaidi, Z. I. & Hussain, M. S. (2019). Technological Pedagogical Content Knowledge (TPCK) and its Implication in Teacher Education. Jamshedpur Research Review-Year-VIII, Volume-V, Sep-Oct.

Hussain, N. (2016). Information and Communication Technology based Teaching and Learning. Delhi: Shipra Publication.

Schrum, L., Thompson, A., Maddux, C., Sprague, D., Bull, G., & Bell, L. (2007). Editorial: Research on the effectiveness of technology in schools: The roles of pedagogy and content. Contemporary Issues in Technology and Teacher Education,7(1), 456-460.

Sweeder, J., & Bednar, M.R. (2001). "Flying" with educational technology. Contemporary Issues in Technology and Teacher Education, 1(3) 421-428.

Shukla, U. (2023). ICT in assessment and evaluation. Retrieved from

https://www.tutorialspoint.com/ict-in-assessment-and-evaluation

☆☆☆

Pahari Tehzeeb-o-Saqafat ik Tajziati Mutala by Dr. Aftab Hussain Shah (Asst.Prof. Centre for research in Gojri, Pahari & Kashmiri Baba Ghulam Shah Badshah University,Rajouri)cell-9858574255

ڈاکٹر آفتاب احمد شاہ، اسسٹنٹ پروفیسر، سینٹر فار ریسرچ ان گوجری، پہاڑی اینڈ کشمیری، بی جی ایس بی یو، راجوری

پہاڑی تہذیب وثقافت اک تجزیاتی مطالعہ

تہذیب عربی زبان دا لفظ اے جس دا لغوی معنی کسی درخت یا پودے کو کٹنا چھٹنا یا تراشنا اے، تا کہ اس اوپر نویاں شاخاں تہ چونجیاں نکلن ۔ فارسی بچ تہذیب دے معنی پاک تہ درست کرنے دے ہین، اسی طرح انگریزی بچ اس کو کلچر یا سولائیزیشن اکھدے ہین جس دا مطلب جسمانی یا ذہنی اصلاح وترقی یا زراعت وکھیتی باڑی کرنا اے۔ مثال دے طور اوپر اسی جس ویلے اکھدے ہاں کہ فلاں شخص بڑا مہذب یا تہذیب والا اے تہ اس تھیں مراد اُس شخص دی گل بات، اٹھنے بیٹھنے دا طریقہ تہ کھانے پینے دا انداز اے، اسی طرح اُنہاں دا رہن سہن دا طریقہ، روایتی معیار، مجلس دے آداب، شعروشاعری، فنون لطیفہ وغیرہ دا ستھرا ذوق تہذیب دے زمرے بچ ایندا اے۔

ثقافت اک اصطلاح اے جیڑی انسانی معاشرے بچ پائے جانے آلے سماجی رویئے تہ اصولاں دے نال نال کسی گروہ، قوم یا طبقے دے عقائد، فنون، قوانین، رسم ورواج انہاں دیاں عادتاں تے طور طریقے کو واضح کردی اے۔ ثقافت عربی زبان دا لفظ اے جس دے معنی کسی قوم یا گروہِ انسانی دی تہذیب دے ہین۔ بقول آئی بی ٹیلر:

''ثقافت توں مراد اوہ علم فن اخلاقیات قانون رسم ورواج عادات خصلتاں تہ صلاحیتاں دا مجموعہ اے جس کو کوئی اس حیثیت نال حاصل کر سکے کہ اوہ معاشرے دا ہی اک رکن اے''۔

پہاڑی تہذیب وثقافت دی تاریخ جدید تحقیق دے مطابق شاردہ پیٹھ یونیورسٹی تھیں بھی قدیم اے۔ ایہی وجہ اے کہ جس ویلے ۲۴ تا ۲۷ء دے دوران نیپال دے راجہ کنشک اول سن اس یونیورسٹی دی بنیاد ہزارہ مقبوضہ کشمیر بچ رکھی۔ اس دور بچ ایہہ سارا علاقہ کشن گھاٹی تکر پہاڑی زبان توں سرفراز آساتہ ایہہ زبان تمام تعلیمی ادارے بچ رائج آسی۔ اس توں ثابت اے کہ پہاڑی زبان تہ تہذیب وثقافت اعلا درجے دی سی لیکن موجودہ وقت بچ اس تہذیب وثقافت دے نقوش بڑے

کہٹ ہین ۔اس تھیں علاوہ خطۂ پیر پنچال بچ ستویں صدی توں انیسویں صدی تکر اتھے دے پہاڑی راجیاں دا راج قائم ریا۔اوہ راجے نرواہن خاندان دے ہوون، ہندو پال خاندان دے یا فر مسلم جرال خاندان دے انہاں سُن ہر دور بچ اپنی تہذیب وثقافت دی الگ شناخت قائم رکھی ۔خطۂ پیر پنچال جس بچ راجوری، پونچھ، اوڑی، کرناہ، بارہمولہ، کپواڑہ اسی طرح مقبوضہ کشمیر بچ ہزاراہ، کاغان، مظفر آباد، وادیِ نیلم، کوٹلی، بھمبھر وغیرہ تمام علاقے ایسے ہین جنہاں بچ گوجری و پہاڑی دی سانجی تہذیب وثقافت قائم اے۔ایہہ دور دراز تہ پہاڑاں بچ رہن والی قبائلی قوم بڑی جفاکش، دلیر تہ بہادر اے جس دی کوئی مثال نیہہ دتی جاسکدی۔اس قوم سُن صدیاں گزرنے تھیں بعد وی اپنا رسم و رواج، رہن سہن، زبان و بیان تہ تہذیب کو برقرار رکھیا۔پہاڑی قوم دی طرزِ معاشرت بچ عجیب رنگا رنگی، تنوع تہ انوکھا پن لبدا اے۔جس بچ تخیر وی اے تہ کشش وی، خوبصورتی تہ تجسس بھی، جس کو دیکھ کے اس قوم بچ ابتدای فطری شکل نظر ایندی اے۔اردو دے مشہور ومعروف ادیب، مترجم و براڈ کاسٹر اشفاق احمد اس قبائلی قوم دا نک نقشہ اس طرح بیان کردے ہین:۔

''ایہہ لوک پتھر یا دھات دے زمانے سی ذرا بعد دے ہین، ایہہ لوک میدانی علاقہ بچ بود و باش اختیار کرنے دے بجائے بلند و بالا پہاڑاں، چوٹیاں تہ گھنے جنگلاں بچ رہنا قدرِ زیادہ پسند کردے ہین۔زیادہ بلند و بالا علاقہ بچ رہنے دی ایہہ وجہ وی اے کہ ایہہ لوک مال مویشی بڑی محبت تہ اشتیاق نال پالنے ہین تہ ایسیاں جگہاں انہاں لوکاں دے پالتو جانوراں واسطے چراگاہ دا کم کردیاں ہین۔''

گرمیاں دے موسم بچ ایہہ قوم میدانی علاقیاں توں نکل کے پہاڑاں تہ ماہلیاں اوپر چلی جُلدی اے جتھے انہاں دیاں بہکاں تہ ٹوہکاں ہوندیاں ہین۔انہاں بہکاں بچ قیام کرنے والے اپنے کھان پین تہ رہین سہن دا سامان اپنے کندھیاں اوپر یا کھوڑے خچراں اوپر کئی میل دی مصافت طے کر گے جُلدے ہین ہور اس سفر دے دوران انہاں کو کئی مشکلاں تہ دشواریاں دا سامنا وی کرنا پیندا اے کئی واری جنگلی درندے انہاں دا جانی تہ مالی نقصان وی کردے ہین اس دے باوا جود ایہہ بہادر قوم انہاں داڈٹ کے مقابلہ کردی اے۔زریں علاقہ تھیں بالائی علاقے دا سفر کر کے جس وقت ایہہ لوک اپنیاں بہکاں بچ پہنچ دے ہین تہ اُتھے دے خوش گوار ماحول، سرسبز تہ شاداب فضا، صاف و شفاف پانی، خوبصورت تہ برف توں لت پت جنگل ہور ہر طرف دی ہریالی بچ اک الگ سکون محسوس کردے ہین۔ایہہ لوک ایسی جگہ بچ اپنا وقت گزاردے ہین جتھے کوئی شہری زندگی دا شور وگل نیہہ ہوندا، بجلی تہ پنکھیاں دی ضرورت نیہہ پیندی یعنی ہنگامہ خیز زندگی دی گرفت توں نکل کے ایہہ لوک اپنا

وقت گزار دے ہین۔

لباس تہ شکل وصورت:۔ پہاڑی قبیلے دے لوک ہر رنگ تہ ہر قسم دا لباس لیند ے ہین۔ بزرگ سلوار قمیض تہ سر اُو پر پگڑی یا کُلہ رکھدے ہین۔ جوان خان سوٹ، پینٹ قمیض تہ خاص موقع او پر کُرتا پجامہ ہور واسکٹ یا صدری لانا زیادہ پسند کردے ہین۔عورتاں رنگین لباس، گلے بچ نقلی موتیاں داہار، باہاں بچ چوڑیاں دے بجائے موٹے موٹے کڑے لانا پسند کردیاں ہین۔ اس تھیں علاوہ زیور بچ ہنس، زنجیری، دولاڑا، کنڈی، چمکیلی، گانی، پھُل ہار، بالا، چھلا، بندے، جھمکے، بڑے تھیوے والی چھاپ، نہیلی، بلاق، لونگ، تیلا، مریدے وغیرہ وی لیند یاں ہین۔ بڈھیاں عورتاں اپنے بالاں دیاں نکیاں نکیاں چوٹیاں کر کے اک بڑی چوٹی بچ ضم کرلینیاں ہین۔ سر او پر کسی موٹے کپڑے دی کشیدہ کیتی دی خوبصورت ٹوپی فر دوپٹا یا شال اُوڑھدیاں ہین۔ اسی طرح اپنے چہرے او پر کوئی میک اپ نہیہ کردیاں، قدرتی خوبصورتی او پر مکمل یقین رکھدیاں ہین، سُرخی نال ہوٹھ سُرخ کرنے دے بجائے اخروٹ دا چھلکا استعمال کردیاں ہین۔ پہاڑی قبیلے دیاں عورتاں، مرداں دے مقابلے حساس دل محنتی، جفاکش تہ زیادہ کم کردیاں ہین حتیٰ کہ پہاڑی قبیلے دے مرد اُچے لمبے، چوڑھے کندھے، چوڑھی چھاتی، مضبوط تہ متناسب جسماں دے مالک ہین۔ ہشاش بشاش چہرے، خوبصورت بال تہ بلوری اکھیاں بہت خوبصورت لگدیاں ہین۔ برف دے موسم بچ ایہہ لوک دھان دی پول (گھاس) چپل دے طور او پر استعمال کردے ہین۔ اسی طرح رسوئی واسطے اسی پرالی دی بنی ہوئی کھیڑی استعمال کردے ہین جیڑی سردی دے موسم بچ گرمی فراہم کردی اے۔ اس تھیں علاوہ بھیڑ، بکری دی اُون دا استعمال کر کے نقاشی والی لوئیاں تہ پٹّو بناندے ہین جیڑے خاص موقع او پر تہ خاص لوکاں واسطے استعمال ہوندے ہین۔

کھیل:۔ پہاڑی قبیلے دے بچے ہر طرح دا کھیل کھیلنے ہین۔ مثلاً چُھپن چُھپائی، گُلی ڈنڈا، رسہ کشی، بلوری، مانگہ تاڑی، پنج گھیٹی، چرخیاں، برف دے گولے مارنا، چور سپائی، کھوکھو، فیتی، چیکنی، ہاکی، فٹ بال، والی بال، کہسُن، دوڑ، چھال، نیزہ بازی، پتھر سٹنا، بالے نکالنا، تیراکی، جانوراں دی لڑائی، پرندیاں دی لڑائی، اسی طرح بڑے لوک گتکا، تلوار زنی، بُھد کر اٹھانا، نشانہ بازی، گُھڑ دوڑ، پولو، لٹھ بازی، بینی پنجہ، ہتھ پنجہ، کبڈی، کُشتی، رسی ٹپہ تاش بازی وغیرہ کھیل اس قبیلے بچ بڑے شوق نال کھیڈے جُلدے ہین۔

خوراک:۔ پہاڑی لوک خوراک دے معاملے بچ خود کفیل ہین انہاں کو کھانے پینے دیاں چیزاں

واسطے شہر دا سفر نیہہ کرنا پیندا۔ گوشت، دودھ، مکھن، لسی، انہاں کو آرام نال دستیاب ہوندی ہے۔ مکی دی روٹی، لسی مکھن تہ چٹنی انہاں دی خاص غذا اے۔ دیسی گھی، لال مرچ نیز ساگ، کچھی، چٹیال، بتھوا، مُرکن، کیاری، گھنڈور، چھو، کُنجی، ہولہ، ہَند، وغیرہ دیسی سبزیاں مکھن پا کے بنا ندے ہین۔ ایہہ لوک اپنے مال مویشی دے دودھ دیاں کئی ذائقے دار سبزیاں تہ کھانے بنا ندے ہین۔ کلیاڑی، اینچھ، کچی لسی، ماش کلاڑ، دہی، شاہی پنیر، دہی کڑی، لسی کڑی وغیرہ پکوان تیار کردے ہین۔ ایہہ لوک عام چاہ دے بجائے مسلون چاہ، ککوئی دی چاہ استعمال کردے ہین۔ اسی طرح دیسی جڑیاں بچ گٹھ، کمرکس، کووڑ، پتریس، نیل کنٹھ، ممیکھ، قینچی گھنڈا، شاتُرا، چھیکنڑ وغیرہ دا حلوہ بنا کے استعمال کردے ہین۔ سرد تہ گرم موسم بچ پیدا ہون والیاں فصلاں واسطے کھیتی باڑی وی کردے ہین۔ مثلاً گندم، مکی، چاول، جوار، باجرا، سریاں، بھبھوری، حالیاں، شٹل، گھنڈیال اسی طرح روزمرہ دی زندگی بچ استعمال ہون الیاں سبزیاں وی کماندے ہین، کڑم، گوبی، گونگلو، ہری مرچ، مولی، مٹر، ٹماٹر، تھوم، پیاز، آلو، کدو، کھیرا یعنی ہر سبزی خود مہیا کردے ہین۔ میدانی علاقے بچ اجکل جدید ٹکنالوجی دا بھرپور استعمال ہوندا اے، مشین یعنی ٹریکٹر نال فصل بوئی تہ کٹی جُلدی اے۔ جبکہ بالائی علاقے بچ بیل جوت کے یا فر مالکانِ زمین کھودائی کرا کے فصل بوندے ہین۔ ہور کٹنے واسطے مزدور استعمال ہوندے ہین جیڑے ماہیے، ٹپے، بیت، سی حرفیاں وغیرہ بول کے کم کردے ہین۔ مثلاً لیتری، گھاس کٹائی، مکی گھوڈائی، کہاڑی، لادی، مکی کٹائی جیسے موقع او پر قبیلے دے لوک جمع ہو کے بولیاں بولدے تہ نال ہی کم کردے ہین۔ پہاڑی قبیلے دے لوک سِلور، اسٹیل، تہ شیشے دے برتن بڑے کہٹ استعمال کردے ہین۔ ایہہ مٹی تہ ترانبے دے برتن استعمال کرنا زیادہ پسند کردے ہین۔ پہاڑی تہذیب وثقافت دی بہترین چیز ایہہ اے کہ ایہہ میز کُرسی دے بجائے، فرشی، قالین زمین او پر ڈاہ کے دعوت کھانا پسند کردے ہین، اور دعوت توں بعد گپ بازی، بیت یا سی حرفی کلام کو سننے سنانے کو تقویت دیندے ہین۔

نام:۔ پہاڑی قبیلے دے لوک اکثر اپنے بچے بچیاں دے ناں پغمبراں تہ انمباواں یا فر پرانے رشی منیاں دے ناں او پر رکھدے ہین۔ اس قبیلے بچ محمد، یوسف، اسماعیل، ابراھیم، یعقوب، اسرائیل، عیسیٰ، موسیٰ، اسحاق، یونس، ہندو ناواں بچ رام، لکشمن، کرشن، کرتار، ابتار وغیرہ زیادہ مشہور ہین۔ اسی طرح بچیاں واسطے فاطمہ، حلیمہ، قُبراء، آسیہ، خدیجہ، زینب، زولیخہ، سیتا، ساوتری، چمپا، چمیلی جیسے ناں رائج ہین۔

مہمان نوازی:۔ پہاڑی قبیلے دے لوک بڑے مہمان نواز ہین، اگر کوئی مہمان انہاں دے کہر آوے تہ اس دی بڑی آو بھگت کردے ہین۔ پہلاں انہاں اگے خشک میوے اخروٹ، بادام، چلغوزے، خوبانی یعنی اس بالائی علاقے دے ہر خوبصورت میوے کو پیش کردے ہین۔ فر حسبِ مناسب سالن بچ مٹن، چکن، دودھ، دہی، لسی، مکھن، گھی، کلیاڑی وغیرہ وی پیش کردے ہین۔ ہور رخصتی دے وقت کئی انمول قسم دیاں جڑی بوٹیاں تہ توفے تحائف وی دیندے ہین۔

مکانات تہ طرزِ تعمیر:۔ پہاڑی قبیلے دے مکان انتہائی سادہ ہور کچے ہین۔ انہاں مکاناں دیاں دیواراں پتھر نال تیار کیتی جُلد یاں ہین۔ تہ چھت واسطے دیودار، چیڑ، تنگ قائل، بیاڑھ جیسے مضبوط درختاں دیاں موٹیاں کڑیاں یا شتیہر اں جنگل توں کٹ کے کئی لوک مل کے اندے ہین ہور مکان او پر سٹدے ہین۔ اس دے او پر چھوٹے بالے یا گاہنڈے رکھدے ہین جس کو 'اوڈ' اکھدے ہین انہاں دے او پر چیری دیاں لکڑیاں جنہاں کو 'چالیاں' اکھدے ہین ترتیب نال سٹیاں جُلد یاں ہین فر انہاں او پر بھوج پتر ہور نال ہی چیڑ یا بیاڑ دا 'تر' سٹیا جُلد ا اے۔ آخر بچ گاوں دے لوک اکٹھے ہو کے اس مکان او پر مٹی سٹدے ہین، جس کو 'لادی' اکھدے ہین۔ لادی توں بعد مکان دی کچے گارے نال لپائی کیتی جُلدی اے جس کو محلے دیاں عورتاں گیت گاہ کے کردیاں ہین۔ اس کچے مکان دے دو فایدے ہوندے ہین پہلا ایہہ کہ مکان کافی مضبوط ہو جلدا اے سردیاں دے موسم بچ برف چاہئے جتنی وی کیوں نہ ہووئے مکان کو نقصان نیہہ ہوندا۔ دوسرا ایہہ کہ سردی بچ مکان کافی گرم رینداے۔ اندر بسنے والے انسان تہ حیوان دوئے پُرسکون زندگی گزاردے ہین۔ ایہہ مکان لگ بھگ تین حصے دا ہوندا اے، پچھلا حصہ 'بانڈی' یا گوہال اے جس بچ مال مویشی رکھے جلدے ہین، دوجہِ حصہِ بچ اہلِ خانہ ریندے ہین ہور تیجئے حصے بچ رسوئی کہر ہوندا اے جس بچ کہرانے دے سارے افراد بیٹھ کے کھانا کھاندے ہین۔ جنس یا غلہ جمع کرنے واسطے لکڑی دا 'کٹھار' یا شاہتوت دی نیلی (ہری) لکڑیاں دی بنائی دی 'پھنڈی' استعمال کردے ہین اسی طرح دیگر کاغذات واسطے لکڑی دا صندوق استعمال ہونداا اے۔

شادی تہ دیگر رسومات:۔ پہاڑی قبائل شادی دی رسومات کو کافی سنجیدگی نال ادا کردے ہین۔ اپنے ہی خاندان یا قبیلے کو رشتہ دینے ہور لینے کو ترجیح دیندے ہین۔ غیر قوم نال رشتہ داری معیوب سمجھدے ہین۔ رشتے طے کرنے بچ والدین دی رضامندی کو کافی ترجیح دتی جُلدی اے، رشتہ طلب کرنے واسطے لڑکے والیا کو ہی ہتھ پیر مارنے ہوندے ہین، لڑکی والا چاہ کہ وی اظہار نیہہ کردا۔ دواں فریقاں

دی طرفوں قوم، قبیلہ، برداری، رہن سہن تہ مکانات دیکھ کے ہی رشتہ طے کیتا جُلدا اے۔ پہلے وقتاں بچ بچپن توں ہی یعنی کسی برادری دار دے کہر بچی پیدا ہوئی تہ دادی یا نانی اس بچی کو اپنے پوتے یا دوتے ناتی واسطے مقرر کر چھوڑ دی آسی، جس دا اک حد تک قوم قبیلے بچ نقصان آسا۔ بچپن بچ طے ہوے دے رشتے کو اگر لڑکا لڑکی نہ منن ہور اک دوجے کو ناپسند کرن ہور شادی واسطے رضامندی دا اظہار نہ کرن تہ دواں فریقاں بچ دشمنی پیدا ہو جُلدی سی جڑی نسل در نسل باقی ریندی سی۔ اس توں واضح ہوندا اے کی پہاڑی قبائیل دے لوک اگر دوستی واسطے جان نشاور کر سکدے ہین تہ دشمنی بچ وی انہاں دا کوئی ثانی نیہہ۔ شادی دیاں تمام رسماں بڑے شوق نال ادا کردے ہین۔ شادی توں پہلاں مگنی ہوندی اے ہور کئی جگہ مگنی دے وقت ہی نکاح ہو جُلدا اے جبکہ رخصتی دا دن مقرر کر چھوڑ دے ہین جس دن دُلہن یا بوٹی آنی ہوندی اے اُس دن دلہے کو باضابطہ تیار کیتا جُلدا اے۔ مہندی، گھانا، سہرا، پانی کپنا، پانی پہرنا، رستہ روکنا، رستے بچ بُدھکر سٹنا وغیرہ تمام رِسماں اس دن منائی جُلدیاں ہین۔ دلہا مناسب بارات نال اپنے رشتہِ داراں دے جُلدا اے اتُھے دودھ پلانا، سُرمالانا وغیرہ رِسماں دے بعد دعوتِ ولیمہ ہوندی ہے۔ دلہن دی رخصتی دے بعد سُسرال بچ دُلہن کو لوں لسی بنوائی جُلدی اے، اسی طرح مکی دی روٹی، رستے بچ جہاڑو، پانی دی گھڑولی بچ سوئی وغیرہ روایتاں اج وی اس سماج بچ رائج ہین۔ دلہن دو دن بعد سُسرال جُلدی اے جس کو 'بتھ پھیرا' اکھدے ہین رشتہ دار یا محلے دیاں پنج، دس عورتاں نال جُلدیاں ہین۔ اسی طرح پہاڑی قبائل بچ مکئی گوڈائی، دھان یا تھل، چھلیاں کوٹنا، لیتری، کہاڑی، لادی وغیرہ کو بڑی خوشی نال منادے ہین نیز انہاں دناں دے موقع اوپر میٹھے چاول، سوجی، مکی دی روٹی، لسی، چٹنی، چکن یا مٹن وغیرہ یعنی ہر بہترین پکوان پکائے جُلدے ہین۔

پورے برِصغیر بچ پہاڑ تہ پہاڑی قبائل دی الگ تہذیب وثقافت اے جیڑی اس قوم سُن صدیاں توں سنبھال کے رکھی دی اے۔ ایہہ لوک اگرچہ تھوڑے ہین اک مخصوص علاقے یا خطے دے ہین لیکن باوقار زندگی جینے دی صلاحیت رکھدے ہین کسی اوپر بوجھ نیہہ، خود انحصار تہ خود اعتماد ہین۔ انہاں اندر خود انحصاری، سادہ طرزِ زندگی، جواں مردی، دلیری، ایمانداری، مہمان نوازی، فطرت پسندی، آزاد خیالی وغیرہ کئی صفتاں موجود ہین جیڑیاں اس قوم کو وقار بخشتیاں ہین، اس قوم بچ شدت پسندی دے بجائے عاجزی وانکساری اے۔ سیاسی، معاشی تہ تعلیمی پسماندگی ہور بدحالی دے باوجود اس طبقے سُن اپنے تہذیبی تہ ثقافتی اوصاف سنبھال کے رکھے دے ہین۔ جو اک اچھے قبیلے تہ معاشرے دی پہچان اے۔☆☆☆

Bengal ke afsana nigaron par taraqqi pasand tahreek ke asaraat by Nasiba Khatoon(Research Scholar, dept. of Urdu , Kazi Nazrul University, Asansol)

نصیبہ خاتون (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، قاضی نذرل یونیورسٹی، آسنسول)

بنگال کے افسانہ نگاروں پر ترقی پسند تحریک کے اثرات

اردو میں افسانہ، داستان اور ناول کے مقابلے میں جدید صنف ہے۔ انیسوی صدی تک افسانوں میں داستانوں کا رواج رہا لیکن اُسی صدی کے وسط میں اردو ناول نگاری کی ابتداء ڈپٹی نذیر احمد کے ہاتھوں ہوئی۔ ناول اردو ادب میں مغرب کے زیرِ اثر آیا اور پھر ناول کے ذریعہ بیسوی صدی کی پہلی دہائی میں مختصر افسانہ کی ابتداء ہوئی۔ اردو کے اولین افسانہ نگاروں میں راشد الخیری، سجاد حیدر یلدرم، پریم چند، نیاز فتح پوری، حجاب امتیاز علی، عظیم بیگ چغتائی وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں بعض ایسے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اپنے افسانوں میں حقیقت پسندی کو پیش کیا اور بعض ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں نے ایک ایسی حسین ولطف انگیز فضا قائم کردی جو دنیا کی تلخیوں سے پرے حسن و جمال کی کیفیت کو ابھار دیتی ہے۔

اردو افسانے کی شروعات چونکہ بیسوی صدی کی پہلی دہائی میں ہو چکی تھی لیکن اردو افسانے کو فروغ ترقی پسندی کے دور میں ملا۔ ترقی پسند تحریک نے اردو شاعری میں نظم کو سب سے زیادہ اثر انداز کیا۔ نظم کے ذریعہ ہی مزدوروں کی حمایت کی گئی اور زندگی کی تلخ حقیقتوں کو پیش کیا گیا۔ وہیں دوسری جانب اردو نثر میں افسانے پر اس دور میں سب سے زیادہ توجہ صرف کی گئی۔ لہذا ترقی پسند تحریک کے دور کو اردو افسانہ کا عہد زریں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ ترقی پسند تحریک کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ اس تحریک کے ذریعہ اردو ادب میں متعدد تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ حسن کا معیار بدل دیا گیا اب حسن محبوب کے بجائے کسانوں اور مزدوروں میں تلاش کیا جانے لگا، دبے کچلے انسانوں کی زندگی اور ان کے مسائل کو موضوع بنایا گیا۔ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف آواز اٹھائی گئی اور ادب کو زندگی سے جوڑ دیا گیا۔ ''ادب برائے ادب'' کی بجائے ''ادب برائے زندگی'' کا نعرہ بلند ہوا۔ ترقی پسند افسانہ

نگاروں میں کرشن چندر،عصمت چغتائی ،راجندر سنگھ بیدی،عزیز احمد،احمد ندیم قاسمی،خواجہ احمد عباس ،شوکت صدیقی،بلونت سنگھ،اختر انصاری،سعادت حسن منٹو،حیات اللہ انصاری وغیرہ شامل ہیں۔پورے ہندوستان کے شاعر وادیب اس تحریک سے متاثر ہوئے اور سرزمین مغربی بنگال بھی اس تحریک کے اثر سے بچ نہ سکا۔

مغربی بنگال ابتدا سے ہی اردو ادب سے منسلک رہا ہے۔اس کی بہترین مثال ۱۸۰۰ء کا فورٹ ولیم کالج ہے۔اس کالج کے ذریعہ دیگر زبانوں کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا اور انگیزوں کو ہندوستانی زبان یعنی اردو زبان سے روبرو کرایا گیا۔ترقی پسندی کا جب دور آیا اس وقت مغربی بنگال میں افسانے کا پہلا دور شروع ہوا حالانکہ مغربی بنگال کے باہر اردو افسانے کا دوسرا دور شروع ہوجاتا ہے۔اس دور سے پہلے بھی بنگال میں افسانے لکھے جاتے تھے لیکن زیادہ تر افسانے طبع زاد نہیں ہوا کرتے تھے۔بنگال کے افسانہ نگاروں نے اس تحریک کا بھرپور ساتھ دیا اور اسی دور میں بہت سے افسانے بھی تحریر کئے گئے۔بنگال کے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں راحت آرا بیگم،شین مظفر،حسن نجمی سکندر پوری،ل۔احمد۔اکبر آبادی،شاہ مقبول احمد،شین مظفر پوری،ضیاء عظیم آبادی،نشاط الایمان،سالک لکھنوی،سہیل واسطی،جاوید نہال،شمس صابری،شمس ندیم،محمود واجد،سعید پریمی،رضا مظہری وغیرہ اہم نام ہیں۔راحت آرا بیگم بنگال کی اولین خاتون افسانہ نگار تسلیم کی جاتی ہے۔ان کی پیدائش ۱۹۱۰ء میں کلکتہ میں ہوئی۔علمی وادبی گھرانے سے تعلق کی وجہ سے ان کے اندر لکھنے کا جذبہ بیدار ہوا اور انھوں نے یکے بعد دیگرے سات افسانوی مجموعے لکھ ڈالے۔ان افسانوی مجموعوں کے نام ''دلنواز''،''پریمی''،''انقلاب''،''بانسری کی آواز''،''شب کی پکار''،''بدو کی بیٹی''،''غنچۂ افسانہ'' ہیں۔ان افسانوی مجموعوں میں کل ۱۲۸ افسانے ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں۔ان افسانوں کے کردار کے ذریعہ راحت آرا بیگم نے سماج میں پھیلی برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔حسن نجمی سکندر پوری کی پیدائش ۱۹۱۳ء میں سکندر پور، اتر پردیش میں ہوئی۔انھوں نے جب بنگال کا رخ کیا تو اس وقت ترقی پسندی کا ماحول تھا یہی وجہ ہے کہ ان کے بیشتر افسانوں میں ترقی پسند کی جھلک نظر آتی ہے۔بنگال آنے سے پہلے انھوں نے صرف شاعری ہی کی تھی لیکن بنگال کی سرزمین سے ہی انھوں نے افسانہ نگاری پر توجہ دی۔''موم کی عورت'' اور ''پھول کھلے ویرانے میں'' ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ان کے افسانوں میں انسان کے دکھ اور اس کی کسک صاف سنائی دیتی ہے۔بعض افسانوں میں اس وقت کی بے بسی اور بے چارگی دیکھنے کو ملتی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''میرے ادبی سفر کا آغاز آزادی سے پہلے ۱۹۳۸ء میں مختصر افسانہ نگاری سے ہوا۔ ۱۹۲۱ء کی تحریک خلافت میں، میں باشعور تو نہیں لیکن باہوش ضرور تھا میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے قصبے کی متعدد معزّز ہستیوں کو بے خوفی، بے باکی اور اپنے ہونٹوں پر ایک پراسرار تبسم لئے جیل جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسی اجتماعی بیداری نے مجھے وطن پرستی کی طرف مائل کیا۔ انگیزوں کی غلامی اور ان کے استحصال سے نفرت دلائی۔ ۱۹۳۸ء سے مارچ ۱۹۵۹ء تک بہ سلسلہ ملازمت میرا قیام کھرگپور مغربی بنگال میں رہا زلفِ بنگال کے ساتھ انقلاب کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ سیاسی سفر میں، بنگال کے انقلاب آفریں ذہنوں نے ہمیشہ ہندوستان کی رہ نمائی کی ہے۔ اسی آب وہوا میں میرے سیاسی اور سماجی شعور کی تربیت ہوئی۔ اور مجھی انسان دوستی کا ایک نیا تصور ملا۔'

(شب چراغ، حسن نجمی سکندر پوری، ۱۹۸۲ء، اسرار کریمی پریس الہ آباد، ص: ۷)

ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام شاہ مقبول احمد کا ہے۔ ان کی پیدائش ۱۹۱۶ء میں بہار کے منگیر میں ہوئی۔ ان کے افسانوں میں اس وقت کی تباہیوں اور بربادیوں کا ذکر ملتا ہے۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں کے یہاں فرد سے زیادہ معاشرے کی اہمیت تھی یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اسی معاشرے کے لوگوں کی پریشانیوں کا حل اپنے افسانوں میں تلاش کیا ہے۔ ان کا افسانہ ''تبدیلی'' اس کی بہترین مثال ہے۔ شاہ مقبول احمد اپنی کتاب ''پانچ افسانے اور انشائیہ'' میں لکھتے ہیں:

''دریں حالات اعتدال وتوازن اس کا اعتراف کا متقاضی ہے کہ ترقی پسند تحریک نے بطور سابق زمیندار وسرمایہ دار اور کسان اور مزدور کو دوش بدوش ہی رکھا مگر ساتھ ہی ساتھ ایک ایسا نقطہ نظر بھی عطا کیا جس نے معاشرے کے ذہن وشعور کو یکسر بدل ڈالا۔ فکر وعمل کے رخ کو پھیر دیا۔ جس کی وجہ سے اونچے اونچے محلوں کے مقابلے میں پست وتاریک خس پوش جھونپڑیوں، ذی اقتدار اقاؤں کے بالمقابل حقیر خدام وملازمین، باوقار تعلقہ دار کے سامنے بے بضاعت کسانوں، سرمایہ داروں کے آگے کم استتاعت مزدوروں نے شاید پہلی بار نئی توقیر وتوانائی حاصل کی۔ اور نئی اقتدار کا نیا جامہ پہنا اب معلم، مزدور، کسان، پیشہ ور، اہل حرفہ، دستکار، کاریگر اور زمرۂ خواتین کے ساتھ جاگیردارانہ نظام کی تحقیر وبے توقیری کے بجائے احترام وعزت، ہمدردی ودردمندی کا جذبہ وابستہ ہو گیا۔ اور اس کے برعکس امراء اور سرمایہ داروں کا طبقۂ اعلیٰ اپنے اصل روپ استحصال، جبر واستبداد کے لبادے میں پہلی بار منظر عام پر آیا۔''

(شاہ مقبول احمد، پانچ افسانے اور انشائیہ، ۱۹۸۰ء، انتخاب از ایک بات، ص:۶، ۷)

شین مظفر پوری کی پیدائش ۱۹۲۰ء میں مظفر پور، بہار میں ہوئی۔ بنگال کے قیام کے دوران انہوں نے بے حد مقبول و معروف افسانے لکھے۔ ان کا شمار بنگال کے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے افسانے ترقی پسندی کے دائرے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ قحط بنگال اور تحریکِ آزادی کے موضوع پر بھی انھوں نے قلم اٹھایا ہے۔ ان کے افسانوں میں بنگال کے حالات کے ساتھ ساتھ بنگال کے انقلابی نعروں کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان کا تعلق کسان گھرانے سے تھا اسی لئے اس طبقے کی پریشانی اور بدحالی سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں انسانی زبوں حالی اور اور بعض جگہ بڑے دلچسپ واقعات ملتے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعوں کے نام ''آوارہ گرد کے خطوط''، ''دکھتی رگیں''، ''کڑوے گھونٹ''، ''لڑکی جوان ہو گئی''، ''دوسری بدنامی''، ''حلالہ''، ''طلاق، طلاق، طلاق''، ''قانون کی بستی''، ''نئی الف لیلیٰ''، ''کسی سے کہنا نہیں'' ہیں۔ نشاط الایمان ایک بے باک افسانہ نگار گزرے ہیں۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ ترقی پسندی سے متاثر ہوکر انھوں نے ہر ایک تنظیم اور مجلس میں شرکت کی۔ اشتراکی نظریہ سے منسلک ہوکر اس کے روح رواں بن گئے اور اپنی تحریروں کے ذریعہ اشتراکی نظریہ کو کافی فروغ پہنچایا۔ ان کے افسانوں میں سماج اور سماج میں پھیلی برائیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ تقسیم ہند کے ذریعہ جو فسادات برپا ہوئے تھے اس کی تصور کشی بھی ان کے افسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''لیل و نہار'' اور ''اوس اور آگ'' کو غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔ ان کے افسانے کے تعلق سے ڈاکٹر عمران قریشی لکھتے ہیں:

''دیگر افسانہ نگاروں کی طرح نشاط الایمان صرف ترقی پسند خیالات و نظریات ہی کے ہو کر نہیں رہ گئے تھے بلکہ انھوں نے اپنے دل و دماغ کی کھڑکیوں کو کھلا رکھا تھا تاکہ باہر سے آنے والی ہوا کے تازہ جھونکوں سے بھی لطف اندوز ہوا جا سکے۔ اسی لئے نشاط الایمان کے دوسرے افسانوی مجموعہ ''اوس اور آگ'' کے افسانے ان کے پہلے افسانوی مجموعے سے نہ صرف قدرے مختلف نظر آتے ہیں بلکہ صاف طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے گاؤں اور گاؤں کے مسائل کے بعد شہر اور شہری زندگی کے مسائل اور پیچیدگیوں کو فنکارانہ طور پر برتا ہے۔''

(ڈاکٹر عمران قریشی، بنگال میں اردو افسانہ آغاز تا حال۔ حصّہ اول، ص: ۱۴۳)

ل۔ احمد نے اپنے ادبی سفر کا آغاز رومانی افسانہ لکھ کر کیا۔ ان کی پیدائش ۱۸۸۵ء میں

آگرہ میں ہوئی۔انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کلکتہ میں گزارا۔وہ انگریزی ادب میں آسکر وائلڈ اور اردو ادب میں سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری سے متاثر تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں رومانیت جابجا دیکھنے کو ملتا ہے۔اردو ادب میں وہ مترجم کی حیثیت سے داخل ہوئے لیکن جلد ہی افسانہ نگاری میں اپنا ایک منفرد مقام بنا لیا۔ان کے افسانوی مجموعوں کے نام ''نغمات''،''انشائے لطیف''،''زندگی کے کھیل اور دن رات''،''صبح وشام''،''ملاحظات نفسی'' ہیں۔ان کا افسانہ ساتھی کا یہ اقتباس دیکھیے:

''یہ دو چار دس خواب دیکھنے والے مزدوروں کی گندی بستیوں میں! تم سکشا کا سچی تعلیم کا بیج لے کر آئے اور بپتا اور مصیبت کو زمین پر بو دیا۔غلام انسانوں کے مرجھائے دلوں میں روشن حقیقت کا چمکتی سچائی کا پودا لگا دیا! ان مزدوروں کے دلوں میں لگا دیا جنہیں ظالم اور لالچی پونجی پتیوں نے گونگا اور اندھا بنا چھوڑا تھا!۔''

(مغربی بنگال میں اردو افسانے کا سفر،عشرت بیتاب،نواز پبلی کیشنز،ص:۳۳)

سالک لکھنوی بنگال کے ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔انہوں نے ترقی پسند تحریک سے قبل ہی افسانہ لکھنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے وہ بنگال کے اوّلین افسانہ نگاروں کی طرح دیگر زبانوں میں لکھے افسانوں کا اردو میں ترجمہ کرتے رہے لیکن پھر تبع زاد افسانے بھی لکھے۔انھوں نے فرسودہ رسم ورواج ،مزدوروں کے اوپر سرمایہ داروں کا ظلم وتسدد وغیرہ کو افسانوں میں پیش کیا ہے۔وہ پریم چند سے متاثر تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں حقیقت نگاری بھی پائی جاتی ہے۔ان کا افسانوی مجموعہ ''عذرا اور دیگر افسانے'' ہے جو ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔ان کا افسانہ ''اچھوت''،''گھر سے دور''،''قمار باز''،''وہ بائیس دن'' وغیرہ بے حد مشہور ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس ان کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''سالک لکھنوی اس وقت اردو دنیا کی سب سے بزرگ،نہایت فعال اور روشن خیال شخصیت کا نام ہے۔صرف بنگال ہی نہیں ساری اردو دنیا میں وہ ایک متحرک صاحب ضمیر اور باکمال قلم کار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ان کا احترام ترقی پسند ادبی تحریک کا معمار کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔وہ شاید اردو کے ان ادیبوں میں آخری ہیں جنہوں نے ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں شرکت کی تھی۔'' (افسانے سالک لکھنوی،ڈاکٹر عمر غزالی،ص:۷)

مغربی بنگال کے افسانہ نگاروں میں سہیل واسطی ایک اہم نام ہیں۔ان کے ابتدائی افسانوں میں ترقی پسندی کی جھلک نظر آتی ہے اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں فسادات کے

بدترین مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔کردار نگاری اور منظر نگاری کی وجہ سے ان کے افسانے اپنی مثال آپ ہیں۔ان کے افسانوں کے کرداروں میں قاری گم ہو جاتا ہے اور منظر نگاری کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سارے مناظر آنکھوں کے سامنے رونما ہو جاتے ہیں۔محمود واجد نے اپنے افسانوں میں حقیقت نگاری سے کام لیا ہے ان کے افسانوں میں گاؤں کی زندگی ،ہجرت کا کرب ،تقسیم ہند کا المیہ وغیرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔انھوں نے جب افسانہ لکھنا شروع کیا تو اس وقت جدیدیت کا دور تھا۔لیکن اس کے باوجود ان کے افسانوں میں ترقی پسندی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ان کا افسانوی مجموعہ ''خزاں کے پھول بہار کے دن'' کافی مشہور ہے۔بنگال کے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام شمس ندیم کا ہے۔انھوں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز ترقی پسند تحریک کے دور سے کیا۔ان کے افسانوں کا لب ولہجہ سادہ وسلیس ہے۔ان کا واحد افسانوی مجموعہ ''آخری وقفے کا کھیل'' ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا جس میں کل ۲۲ افسانے شامل ہیں۔ان افسانوں کے علاوہ چند افسانے دیگر رسائل میں بھی شائع ہوئے ہیں۔افسانہ ''شعلے رواں دواں''، ''چتا''، ''گرداب'' وغیرہ ترقی پسند موضوعات پر مبنی ان کے بہترین افسانے ہیں۔

اس کے علاوہ بنگال کے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں شہزاد منظر ،رضا مظہری ،ابراہیم ہوش ،سعید پریمی ،عابد ضمیر وغیرہ کا نام آتا ہے۔ترقی پسند افسانہ نگاروں کی بدولت آج بنگال کا افسانوی ادب اپنی آب وتاب کے ساتھ افق پر چمک رہا ہے۔حالاں کہ ترقی پسندی کا زمانہ اب نہیں رہا لیکن آج بھی اس تحریک کے موضوعات دیگر افسانوں میں نظر آتے ہیں۔

☆☆☆

Maulana Reyazuddin Amjad Reyaz by Mohd. Yasub (Research Scholar dept. of Urdu KMCL University, Lucknow)
محمد یعسوب (ریسرچ اسکالر، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ)

مولانا ریاض الدین امجد ریاض

مولانا ریاض الدین امجد ریاض وطناً سندیلوی تھے۔ آپ کی پیدائش آگرہ میں ۱۸۱۵ء میں ہوئی۔ پدر نامدار مولوی غیاث الدین اشرف تھے۔ واضح ہو کہ ریاض صاحب کا تعلق حمد اللہ شارح مسلم العلوم کے خانوادے سے تھا۔ آپ نیک سیرت خوبصورت انسان اور اپنے عہد کے جید عالم باکمال صوفی بزرگ شاعر وادیب تھے۔ بیک وقت اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی کالم تحریر کرتے تھے۔ آپ کی علمی استعداد عالمانہ تھی۔ آپ نے جو بھی علمی اکتساب کیا تھا وہ اپنے زمانے کے بزرگوں سے کیا تھا۔ باقاعدہ کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا تھا۔ متھرا میں پیشہ وکالت سے جڑے تھے بعد میں اس پیشہ سے کنارہ کشی اختیار کی۔ صدر امینی میں میر منشی بن گئے بعد ازاں مرادآباد میں کلکٹری محکمہ سے منسلک ہو گئے۔ مولوی نیاز علی پریشاں رشتے میں پھوپھی جائے برادر تھے۔ اپنی کتاب افسانہ عشق میں چند عمائدین شہر کے احوال بھی قلمبند کئے ہیں۔ اس میں آپ کے متعلق رقم کیا ہے:

''آج معظم مولوی ریاض الدین امجد صاحب فن شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے ہیں اور نثاری میں تمنع المثال ہیں۔ غزل، رباعی، قطعہ، مثنوی، فرد، بیت، قصیدہ، مرثیہ، سلام سب کچھ کہا ہے۔ تمام کلام سننے اور دیکھنے کے لائق ہے''۔ (نقل از تذکرہ مشاہیر سندیلہ، ص ۱۹۵)

متذکرہ بالا عبارت سے معلوم ہوا کہ آپ نے تمامی صنف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن یہ ساری چیزیں ان کے وصال کے بعد ضائع ہو گئیں۔ فن شعر گوئی میں وزیر لکھنوی سے شرف تلمذ تھا۔ تو آپ کی شاعری میں بھی لکھنوی رنگ آنا لازمی تھا۔ آپ کو شعر گوئی اور زبان و بیان پر پوری قدرت حاصل تھی۔ حسن صوری و باطنی میں منفرد تھے۔ دہلی کے زمانہ قیام میں دو بار مرزا غالب سے ملاقات ہوئی۔ آپ کی اولین ملاقات مرزا غالب سے ۶ محرم الحرام ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۶ جولائی ۱۸۶۰ء

کو مولانا نیاز علی پریشاں کے ساتھ ہوئی۔اس ملاقات کا ذکر سرورِ ریاض میں اس طرح کیا ہے:

''سبحان اللہ ذات جامع الکمالات کے اوصاف خارج از شرح و بیان ہیں۔سردار زماں دانان شیراز واصفہان ہیں مغتنمات روزگار نفیس الطبع، قدیم الوضع، عالی وقار، والا تبار ناخدائے سفینۂ سخن ورے در یکتای بحر معنی پرورے، آسان وزمین ذی کمال بردیان بام نازک خیال مجموعہ اوراق مندی شیرازہ اجرائے جرائد غنی ہندی بھر سپہر بلاغت اندیشہ فصاحت رشک انورے، روشن طالب، حق تو یہ ہے کہ شعراء ماضی وحال ہر فن وشاعری میں غالب قدمیانہ نہیں بلکہ درازا کبرآباد کے سارے انداز کنزی ہوئے سیف کج سیاہ ذہاڑی کے بار گور چٹے خوبصورت بدرجہ کمال''۔

اسی کے آگے فرماتے ہیں:

''میاں نیاز علی نے میری طرف اشارہ کیا کہ یہ بھی شاعر ہیں۔اس فن میں کچھ کچھ ماہر ہیں۔فرمایا کہ کچھ سنائیں۔طبع کے جوہر دکھائیں۔غرض کہ ہیچ مدان نے دوغزلیں ایک فارسی دوسرے اردو کے سنائیں۔مرزا نے جس کے سزاوار نہ تہا فرمائیں۔فارسی غزل کے چند اشعار اس طرح ہیں جو ریاض صاحب نے مرزا غالب کی خدمت میں پیش کئے تھے:

شنیدم از صبا می آید نیک سہسوار من   زبان دوام کہ برخبر دو بر تعظیمش غبار من

نمی آید صبا اکنون زمدت برمزار من   غبار خاطر اوگشت شاید ایں غبار من

ریاض از آرزوئے وصل آن گل چاک گردیدم   کہ اس سودا چو آتش سوخت آخر مشت خار من

اس کے بعد آپ نے اردو کی غزل سنائی۔غضب کی محفل رہی۔آپ نے ملاقات میں غالب سے بہت فیض حاصل کیا۔اور غالب نے بھی اپنا کلام سنایا۔اردو غزل کے چندر اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ اٹھے پہلو سے ہم بیٹھے رہے   دل کو سینہ کو جگر کو تھا کے

لائے ہاتھوں ہاتھ اہل کارواں   ورنہ ہم تھے ایک دوھے کام کے

خوب لکھی ہے غزل تم نے ریاض   کیوں نہ ہو قابل ہو تم انعام کے

مولانا نے مرزا غالب کی غزل کے مقطع پر دو مصرعے بہ کر قطعہ سنایا۔

اب نہیں ہیں آپ کے مصرف کے ہم   رات کے دن کے نہ صبح وشام کے

عشق نے غالب نکما کر دیا   ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

(ریاض سرور، ص ۲۳، ۲۴، ۲۵)

غالب نے مولانا کی قادر الکلامی کا اعتراف کرتے ہوئے ارشاد کیا کہ ریختی زبان میں

اچھے معنی اخذ کرتے ہواور اچھا شعر تخلیق کرتے ہو۔ مولانا کی چاہے نثر ہو یا نظم سبھی میں آپ کی قادر سخنی جھلکتی ہے۔ گو مولانا نے دقیق الفاظ کا استعمال نثر یا نظم میں نہیں کیا ہے پھر بھی ریاض سرور کی نثر میں شوخی وشنگی اور رنگین بیانی سے کام لیا ہے بالخصوص اس مقام پر جہاں زن بازاریوں، کسبیوں و دوشیزاؤں کا تذکرہ کیا ہے۔ سرور ریاض میں شوخی و رنگینی مصنف کے عالم شباب کا پتہ دیتی ہے۔ وہ جوانی کی مستیوں میں بے خود تھے۔ سفرنامے کو پرلطف بنانے کے لئے جابجا اشعار سے بھی کام لیا ہے۔ اور کہیں کہیں پوری پوری غزل، مرثیہ اور قطعہ بھی رقم کیا ہے۔ رقم کئے جانے والے اشعار اکثر وزیر لکھنوی کے ہیں جو ان کے استاد تھے۔ علاوہ ازیں اس کتاب میں خواجہ میر درد، ناسخ، آتش، نظیر، انیس وغیرہ کے اشعار تحریر کئے ہیں۔ ساتھ ہی عربی مقولہ بھی غالب کی ملاقات میں درج کیا ہے۔ مصنف کی دو ملاقاتیں غالب کے دولت کدے پر ہوئیں۔ آپ نے مرزا کو انتہائی قریب سے دیکھا تھا ان کی نشست و برخاست، طرز گفتگو، وضع قطع، بود باش کو من عن جیسا دیکھا محسوس کیا تحریر کر دیا۔ مختار الدین احمد لکھتے ہیں:

''اب تک جن لوگوں کی مرزا سے ملاقات کا حال معلوم ہوا ہے جن کے ملاقات کی تاریخیں متعین ہوسکیں ان میں یہ ملاقات اور غوث علی شاہ کے علاوہ اس کے اندراجات سب سے قدیم ہیں۔ اس لئے بہت اہم ہیں''۔ (سیر دہلی موسم سرور ریاض، ص ۴)

اطہر نفیس تحریر کرتے ہیں:

''مولانا ریاض خواجہ وزیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ چنانچہ ان کا تمام تر کلام اسی لکھنوی آرٹ کا نمونہ ہے۔ اس زمانے میں لکھنؤ کا کوئی شاعر اس بے لطف و بے مزہ انداز سخن سے اپنا دامن نہ بچا سکا۔ سیکڑوں کو یہ انداز سخن لے ڈوبا۔ مولانا ریاض صاحب کو تمام اصناف سخن پر قدرت کاملہ حاصل تھی''۔

(تذکرہ مشاہیر سندیلہ، ص ۱۹۷)

مولانا کا عقد مسنون ان کے خانوادے میں ہوا۔ آپ کے گلشن میں تین بچے و دو بچیاں تولد ہوئیں۔ بڑے بیٹے مولوی ظہیر الحسن مرحوم تھے دوسرے امیر الحسن اور تیسرے نظیر حسن مرحوم۔ امیر الحسن سرسان علی گڑھ میں مقیم تھے جن کے بیٹے مقبول حسین ہوئے۔ نظیر حسن مرحوم متھرا میں مقیم رہے ان کے بیٹے نظیر الحسن نائب ناظر کلکٹری ہردوئی کے عہدے سے سبکدوش ہوئے اور بڑے بیٹے مولوی ظہیر الحسن المعروف جھاؤمیاں کے پسر زادے ڈاکٹر معین الدین احمد نے ہومیو پیتھک کالج ہردوئی میں بطور پرنسپل اپنی خدمات انجام دیں۔ ریاض صاحب کی بڑی بیٹی سید احمد علی مرحوم زمیندار

سرسان سے منسوب تھیں اور چھوٹی بیٹی غریب اللہ بن شیخ امین اللہ کرمانی اناوی سے، ان کے بطن سے ایک لڑکا شیخ نعیم اللہ کرمانی تولد ہوا۔ ریاض صاحب آخری ایام میں علیل رہنے لگے تھے اور گراں گوش ہونے سے کم سننے لگے تھے۔ ۱۸۹۰ء میں سخت علالت میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

کتابیات:

۱۔ نقل از تذکرہ مشاہیر سندیلہ

۲۔ ریاض سرور

۳۔ سیر دہلی موسم سرور ریاض

۴۔ تذکرہ مشاہیر سندیلہ

☆☆☆

Ahde Tufail mein Urdu Sahafat by Simi Rukhsaar (Research Scholar
dept. of Urdu Rani Ganj Girls College, Rani Ganj
سیمیں رخسار (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، رانی گنج گرلس کالج، رانی گنج)

عہد طفیل میں اردو صحافت

محمد طفیل کی صحافتی خدمات کا جائزہ پیش کرنے سے پہلے میں ان کے زمانے میں شائع ہونے والے اخبارات اور رسائل پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ ''نقوش'' سے قبل بھی اردو زبان میں ادبی رسائل اور اخبارات شائع ہو رہے تھے اور ''نقوش'' کے بعد بھی نئے نئے ادبی رسائل کی شروعات ہوتی رہی ہے۔

روزنامہ ''نوائے وقت'': پاکستا کے شہروں اسلام آباد، لاہور، کراچی اور ملتان سے شائع ہونے والا اردو زبان کا ایک اہم روزنامہ تھا۔ ''نوائے وقت'' کا آغاز ۱۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو ہوا تھا پہلے یہ ہفت روزہ تھا بعد میں روزنامہ میں تبدیل ہو گیا۔ اخبار کی بنیاد حمید نظامی نے رکھی تھی۔ یہ پہلے پندرہ روزہ اخبار کی صورت میں جاری کیا گیا پھر ہفتہ وار چھپتا رہا اور بالآخر روزنامہ اخبار کے طور پر شائع کیا جانے لگا۔

روزنامہ ''جنگ'': جنگ پاکستان میں اشاعت کا آغاز ۱۶ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ہوا۔ روزنامہ ''جنگ'' میر خلیل الرحمن نے ۱۹۳۹ء میں دہلی سے شروع کیا۔ اس وقت کی پیش نظر برصغیر کے مسلمانوں کے حق میں آواز بلند کرنا اور مسلم لیگ کی ترجمانی کرنا تھا ان دنوں جنگ عظیم کی خبروں سے لوگوں کو بہت دلچسپی تھی اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ جنگ کی خبریں چھاپتے تھے اخبار کا نام جنگ بھی اسی لیے رکھا گیا۔ جنگ ابتدا میں شام کا اخبار تھا۔ ۴ فروری ۱۹۴۸ء سے صبح کے اوقات میں شائع ہونے لگا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے بعد کراچی کو دارالحکومت بنایا گیا جہاں ہوائی اڈے کے علاوہ بندرگاہ کی سہولیت بھی موجود تھی۔ کراچی ایک ابھرتا ہوا صنعتی شہر تھا جہاں اخبارات کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ دہلی کے تین مسلم اخبار روں یعنی روزنامہ ڈان، روزنامہ جنگ اور روزنامہ انجام نے آزادی کے بعد اپنے دفاتر کراچی منتقل کیے۔ کراچی میں منتقل ہونے کے بعد ''جنگ'' اور ''انجام'' میں مقابلہ جاری

رہا۔ روزنامہ ''انجام'' کو اس کے آخری انجام تک پہنچانے کے لیے میر خلیل الرحمن نے ''انجام'' سمیت دیگر سبھی اخبارات کو پیچھے چھوڑ دیا۔

امروز: فیض احمد کا اخبار تھا۔ شدید ترقی پسند ذہن رکھتا تھا اپنے وقت کے معروف اہل قلم ان اخبار سے وابستہ تھے اسے اعلیٰ درجہ کا اخبار تصور کیا جاتا تھا۔

چٹان : شورش کاشمیری کا نامور اخبار تھا اپنی بے باکانہ تحریروں کی وجہ سے منفرد اخبار تھا۔ شورش کاشمیری نہ صرف یہ کہ اعلیٰ درجے کے اہل قلم تھے بلکہ سیاسی، ادبی اور سماجی سرگرمیوں پر غائل نگاہ رکھتے تھے اور کسی بھی طرح کی بے اعتدالی پر انگلی اٹھانے سے نہیں چوکتے تھے۔

حریت: حریت بھی اپنے زمانے کا مقبول اخبار رہا ہے۔ یہ ایک عام طرز کا اخبار تھا لیکن دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔

سب رس: ''سب رس'' جنوری ۱۹۳۸ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔ یہ ایک ادبی رسالہ تھا۔ یہ رسالہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی زیر نگرانی اور ان کے صاحبزادے میر محمد علی خاں میکش کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اس رسالے میں افسانے، نظمیں، غزلیں، مضامین اور نئی کتابوں کے پر تبصرے وغیرہ شائع ہوتے تھے۔ اس رسالے کے اہم قلم کاروں میں محی الدین قادری زور، عبداللہ العمادی، سلطان سید یوسف علی، شیورانی دیوی اہلیہ پریم چند وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ آج کل اس کے مدیر پروفیسر بیگ احساس ہیں۔

نیا ادب: ''نیا ادب''، لکھنو سے شائع ہونے والا ایک اہم رسالہ تھا۔ اس کا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا اس رسالے کو جوش ملیح آبادی کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس رسالے میں تمام ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ یہ رسالہ بہت کم عرصے تک جاری رہا اور ۱۹۴۳ء میں یہ بند ہو گیا۔ پانچ سال کے بعد یہ رسالہ علی سردار جعفری کی ادارت میں اگست ۱۹۴۸ء میں پھر سے شائع ہونے لگا۔

معاصر: ''معاصر'' یہ رسالہ نومبر ۱۹۴۰ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کے مدیر ڈاکٹر عظیم الدین احمد تھے۔ اس رسالے کے پہلے شمارے میں کلیم الدین، حافظ شمس الدین، پروفیسر اختر اورینوی اور عظیم الدین احمد شامل تھے۔ یہ ایک تحقیقی اور تنقیدی رسالہ تھا۔ اس رسالے میں افسانے اور ناول وغیرہ بھی شائع ہوتے تھے۔ نومبر ۱۹۴۰ء سے مئی ۱۹۴۹ء تک اس کے مدیر ڈاکٹر عظیم الدین احمد تھے اس کے بعد ڈاکٹر عبدالمنان بیدل اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۷۲ء تک اس کے ادارتی فرائض

انجام دیے۔ ان کے بعد کلیم الدین احمد اس رسالے کے مدیر مقرر ہوئے۔ کلیم الدین احمد کے بعد پروفیسر مختار احمد نے ''معاصر'' کے بعد بنے۔ یہ صدر شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر تھے۔ یہ ایک ماہ نامہ رسالہ تھا۔ ملک کی تقسیم اور فسادات کے اثرات کے سبب اس رسالے کی اشاعت کچھ عرصے تک بند ہوگئی تھی لیکن ۱۹۴۹ء میں یہ دوبارہ شائع ہونے لگا۔ معاصر نے علاقائی ادب پر زیادہ زور دیا ۔اس رسالے میں اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے ترجمے بھی شائع ہوتے تھے۔

فانوس : یہ رسالہ ماہ نامہ تھا۔ ۱۹۴۰ء میں بنگلور سے شائع ہوتا تھا۔ فانوس کے مدیر فرید انصاری بھوپالی تھے۔ اس رسالے میں علمی، ادبی، تحقیقی، تاریخی اور اخلاقی مضامین وغیرہ شائع ہوتے تھے۔ جوش ملیح آبادی، مولانا ماہر القادری، مخدوم محی الدین اور خلیل سیمابی وغیرہ کی تخلیقات اس رسالے میں شائع ہوتے تھے۔

آج کل: یہ رسالہ ۵ رمئی ۱۹۴۱ء میں دہلی سے پشتو زبان میں شائع ہوا۔ یہ پندرہ روزہ مجلہ تھا جو ''نن پرون'' کے نام سے شائع ہوا بعد میں یہ رسالہ اردو زبان میں شائع ہونے لگا کیوں کہ دہلی میں اردو داں طبقے کی تعداد زیادہ تھی اس لیے عوام کی خواہش کی بنا پر ۱۰ رجون ۱۹۴۲ء میں اس کا اردو اڈیشن شائع ہوا۔ شروع میں اس میں ادبی مضامین کے بجائے سیاسی مضامین زیادہ شائع ہوتے تھے بعد میں اس رسالے میں تنقیدی، تحقیقی، سیاسی مضامین وغیرہ کے علاوہ شاعری، کتابوں کے تبصرے وغیرہ جیسے مضامین بھی شائع ہونے لگے۔ یہ رسالہ اردو میں ہونے کی وجہ سے کافی مقبول ہوگیا۔ ۲۵ رنومبر ۱۹۴۲ء میں اس کا پشتو نام بدل کر'' آج کل'' رکھ دیا گیا۔ یہ رسالہ اتنا مقبول ہوا کہ دیگر ممالک کے لیے بھی اہمیت کا حامل بن گیا۔ لہٰذا یہاں سے'' آج کل'' کے نئے دور کی ابتدا ہوئی۔ یہ رسالہ آزادی سے پہلے انگریزی حکومت کی نگرانی میں نکلتا تھا لیکن آزادی کے بعد ہندوستانی حکومت کی زیر نگرانی شائع ہونا شروع ہوا۔'' آج کل'' نے بہت سے نمبر نکالے ابوالکلام آزاد نمبر، افسانہ نمبر ، غالبؔ نمبر، اردو شاعری نمبر، اردو نمبر، خواجہ حسن نظامی نمبر، خواتین نمبر وغیرہ شائع کیے۔ اس رسالے کے قلم کاروں میں رشید احمد صدیقی، جوشؔ، اوپندر ناتھ اشک، بلونت سنگھ اور مسعود حسین خاں وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ اس وقت اس کے مدیر حسن ضیاء ہیں۔

ادیب: یہ ماہ نامہ مئی ۱۹۴۱ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ یہ رسالہ سید محمد ارتضٰی واحدی اور فصیح الدین احمد کی زیر نگرانی شائع ہوا۔ اس رسالے میں افسانے، غزلیں، نظمیں اور مضامین وغیرہ شائع ہوتے تھے ۔سجاد حیدر یلدرم، عبدالباری آسی، مولانا ابوالکلام آزاد، سلمٰی صدیقی، محترمہ نذر سجاد، زیب النساء اور

صالحہ عابد حسین وغیرہ جیسے قلمکار شامل ہیں۔

مصنف: یہ ایک سہ ماہی رسالہ تھا جو علی گڑھ سے شائع ہوتا تھا۔ اس رسالے کے مصنف سید الطاف علی بریلوی تھے۔ یہ رسالہ فروری ۱۹۴۲ء میں جاری ہوا۔ شروع میں یہ رسالہ نظامی پریس بدایوں سے چھپتا تھا بعد میں یہ علی گڑھ سے شائع ہونے لگا۔

نیا دور: رسالہ ''نیا دور''، لکھنو سے شائع ہونے والا ایک ماہنامہ ہے۔ جس کا پہلا شمارہ ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ یہ رسالہ حکومت اتر پردیش سے شائع ہوتا ہے۔ ''نیا دور'' کی اشاعت کا مقصد صحت مند ادب کو فروغ دینا ہے۔ اس زمانے میں اس رسالے کے مدیر علی جواد زیدی اور نائب مدیر فرحت اللہ انصاری تھے۔ اس ادبی رسالے میں فراق گورکھپوری، نیاز فتح پوری اور علی عباس حسینی وغیرہ جیسے ادیب اور شاعر شائع ہوتے رہے ہیں۔ ''نیا دور'' میں شائع ہونا لوگ بہت فخر کی بات سمجھتے تھے۔ اس رسالے نے کئی خصوصی شمارے اور گوشے شائع کیے ہیں۔ جیسے اثر لکھنوی نمبر، غالب نمبر، امیر خسرو نمبر اور تعمیری نمبر وغیرہ ہیں۔

افکار: ''افکار'' کراچی سے شائع ہونے والا ایک ادبی جریدہ تھا جسے اردو کے معروف شاعر صہبا لکھنوی نے ۱۹۴۵ء میں جاری کیا تھا۔ یہ ایک ادبی رسالہ تھا لیکن اس میں اشتہارات خوب چھپتے تھے۔ اس رسالے میں افسانے، نظمیں، غزلیں، ڈرامے اور ترجمے وغیرہ کے علاوہ کتابوں پہ تبصرے بھی خوب شائع ہوتے تھے۔ اس رسالے نے بہت سے خصوصی شمارے نکالے اور زندہ شخصیات پر بھی نمبرات شائع کیے۔

سویرا: ''سویرا'' یہ دو ماہی رسالہ تھا جو ایک اشاعتی ادارے ''نیا ادارہ'' (لاہور) سے شائع ہوا کرتا تھا۔ اس میں نظمیں، غزلیں، مقالات، افسانے، ڈرامے وغیرہ شائع کیے جاتے تھے۔ ''سویرا'' کے ہر شمارے میں نمبر درج ہوتا تھا لیکن اشاعت نہیں جس کی وجہ سے ''سویرا'' کب سے نکلنا شروع ہوا؟ یہ معلوم نہ ہو سکا۔ شمارہ نمبر ۱۲ کے عنوان کے تحت ادارہ کی جانب سے جو تحریر شائع ہوئی اس کے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''سویرا'' ۱۹۴۷ء کے آس پاس جاری ہوا ہوگا۔ ذیل میں یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''سویرا کے گزشتہ اور موجودہ شمارہ کے درمیانی عرصہ میں ایک بڑا اہم ادبی واقعہ ہوا ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل پاکستان کانفرنس جو ۱۲ اور ۱۳ رجولائی کو کراچی میں منعقد ہوئی، اس کانفرنس میں انجمن نے اپنے ۱۹۴۹ء کے انتہا پسندانہ منشور کو منسوخ کر کے ایک نیا منشور منظور

کیا۔''(سویرا،شمارہ نمبر ۱۲،ص:۵)

اس رسالے کو احمد راہی اور نذیر چودھری ترتیب دیتے تھے۔ ہر شمارے میں ''جان پہنچان '' کے عنوان سے احمد راہی کا ابتدا میں ایک مضمون ہوتا تھا۔ آگے چل کر اس رسالے کو ترتیب دینے والوں میں حنیف رامے، احمد ندیم قاسمی اور ساحرؔ لدھیانوی کے نام بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ واضح ہو کہ سویرا میں ساحرؔ کے انقلابی اور باغیانہ اداریوں کے سبب ان کے خلاف پاکستان میں وارنٹ بھی جاری ہوا تھا۔ سویرا ایک ضخیم رسالہ تھا۔ اس رسالے میں جوشؔ، فیضؔ، ساحرؔ، احمد ندیم قاسمی، قتیلؔ شفائی، ن۔م۔راشد، کرشن چندر، منٹو، عصمت چغتائی اور جیلانی بانو وغیرہ کے مضامین اور شاعری وغیرہ اس میں چھپتے تھے۔ اسی دور میں محمد طفیل نے بھی ایک ادبی رسالہ جاری کرنے کا منصوبہ بنایا۔ محمد طفیل نے ''ادارہ فروغ اردو'' کے تحت ادبی رسالہ مارچ ۱۹۴۸ء میں جاری کیا۔ یہ ایک ایسا دور تھا جس میں ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے ادبی رسالے کی بھر مار تھی۔ محمد طفیل کا رسالہ ''نقوش'' ان میں سے ایک تھا۔ یہ ایک ادبی اور معیاری رسالہ تھا اس رسالے نے اردو ادب کے معیار کو کافی بلندی پر پہنچا دیا۔ جس طرح مشرق سے سورج طلوع ہو کر دنیا کو روشن کرتا ہے اسی طرح لاہور، پاکستان سے ''نقوش'' طلوع ہو کر ادبی دنیا کو روشن کرتا ہے۔ ''نقوش'' صرف پاکستان ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ ہندوستان کے لوگوں نے بھی اس سے فیض یابی حاصل کی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے محمد طفیل کو ''محمد نقوش'' کا خطاب دیا تھا۔ یہ خطاب ان کو اتنا پسند آیا کہ وہ اکثر خود کو محمد نقوش لکھتے تھے۔ اردو کی ادبی صحافت میں جو قدر و منزلت ''نقوش'' کو حاصل ہوئی وہ دوسرے کسی اور رسالے کے حصے میں نہیں آئی۔

لہٰذا اردو صحافت آج بھی زندہ ہے حالانکہ اس کی ترقی کی رفتار کچھ کم ہو گئی ہے لیکن اس کے باوجود آج بھی ایسے کئی اخبارات اور رسائل شائع ہوتے ہیں جو اردو زبان کی خدمت کر رہے ہیں۔

☆☆☆

Internet : Ek Jaal by Neha Rafeeque (Research Scholar, Dept. of Urdu Barkatullah University Bhopal)

نیہا رفیق (ریسرچ اسکالر شعبۂ اُردو، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال، ایم پی)

انٹرنیٹ: ایک جال

''انٹرنیٹ ماضی میں اِس کا بول بالا اِتنا نہیں تھا جتنا کہ حال میں ہوتا جا رہا ہے۔ دیکھا جائے تو ماضی میں بھی اِس کا نام اِتنا تو اہم نہیں تھا لیکن حال کے مقابلے میں کچھ حصّہ تو کم ہی تھا۔ ''انٹرنیٹ'' کمپیوٹر کے ایک جال کی مانند ہے، جس نے تمام دنیا کو اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے۔ آج کل کے نوجوانوں کے بارے میں اگر بات کی جائے تو اُن کا ۸۰ فیصدی وقت اِسی پلیٹ فارم پر گزر رہا ہے۔ کچھ نوجوان اِس سے فوائد حاصل کرتے ہیں تو کچھ اِس کا غلط استعمال بھی کر رہے ہیں۔ ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں، یہ چیز آغازِ دنیا سے چل آ رہی ہے۔ اگر کسی چیز کے فوائد ہوتے ہیں تو اُس کے ساتھ ہی اُس کے نقصانات بھی لازمی ہوتے ہیں اور سب سے پہلی اور بڑی بات یہ ہے کہ یہ اُس کے استعمال کرنے والے کے اوپر منحصر ہے کہ وہ کس طرح سے اِس کا استعمال کر رہا ہے۔ جس طرح دنیا میں اللہ نے ہمیں زندگی جینے کے طریقے کو سمجھانے کے لیے اپنے نبی ﷺ کو بھیجا تھا، اگر ہم اُن کی سنتوں پر عمل کرتے ہیں (پورے مکمل طور پر) تو ہم پر جنت واجب ہو جاتی ہے، ٹھیک اُسی طرح اگر اِس فلیٹ فارم کا صحیح چیزوں کے لیے استعمال کیا گیا تو یہ انسان کے لیے جنت کی مانند ہے اور نہیں کیا گیا تو اِس فلیٹ فارم دوزخ کو بننے میں دیری نہیں لگتی۔

سوشل میڈیا کا جال نہ صرف ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے اور ہندوستان تک ہی محدود ہے۔ یہ ہم سبھی اچھی طرح جانتے ہیں اور آج کل بچہ بچہ یہ بات جانتا ہے کہ یہ بیرونی ممالک اور پوری دنیا میں ایسا پھیلا ہوا ہے کہ سبھی لوگ اس جال میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ ایک بات غور و فکر کی ہے کہ آج بھی بڑے بڑے شعراء، مصنّفین ہیں جو اِس پلیٹ فارم کو بلندیوں کی سیڑھیوں پر چڑھانے کے لیے پُرزور کوشش رات دن کر رہے ہیں اور ایک طرف نوجوان ہیں، وہ ۸۰ سے ۹۰ فیصد اِس کی برائیوں اور خامیوں کے پیچھے لگے بیٹھے ہیں۔ اگر نوجوان اس کی خامیوں کی طرف متوجہ ہو کر خوبیوں کی جانب اپنا ذہن لگائیں تو یہ انٹرنیٹ اُن کو بلندیوں کے اعلیٰ درجات پر بہت جلد پہنچا دے گا۔

انٹرنیٹ نہیں ہوتا تو کورونا (Corona) کے وقت ورک فرام ہوم (Work from Home) نہیں ہوتا جیسا کہ میں نے کہا کہ ہر چیز اپنے فوائد کے ساتھ نقصانات بھی لاتی ہے۔ اکثریت سے ایسا ہوتا ہے کہ کبھی اِس سے نقصان ہوجاتا ہے اور کبھی فائدہ۔ ورک فرام ہوم نے بہت سے نوجوانوں کو جو بہت بیروزگار تھے روزگار دلایا اور جو اس وجہ اپنی نوکریاں گنوا چکے تھے کیونکہ کورونا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا اور باہر نکلنے پر پابندیاں تھیں، اُنھوں نے کمائی کا نیا ذریعہ گھر بیٹھے پالیا۔ پوری دنیا میں سب سے کم قیمت پر انٹرنیٹ چارجیز (Internet Charges) ہندوستان میں ہی ہیں، جس سے کورونا کے وقت لوگوں نے خوب فوائد حاصل کیے اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ کورونا جانے کے بعد بھی Work from Home تو برقرار ہی رہا جو آج بھی برقرار ہے۔

انٹرنیٹ سبھی کے لیے اِتنا لازمی ساجزو بن گیا ہے کہ اگر اِس کے رابطے کو ایک روز کے لیے کاٹ دیا جائے تو کیا ہوگا۔ افواج، قومی ادارے، ہوائی کمپنیاں، تعلیمی ادارے اور نہ جانے کون کون انٹرنیٹ کا استعمال روزمرہ کی زندگی میں کررہا ہے۔ اگر ایک دن کے لیے صرف ایک ہی دن کی بات کی جائے کہ اِسے کاٹنے کی تو تمام نظام اِن اداروں کا درہم برہم ہوجائے گا لیکن اِس کے بند ہونے کا ایک بے حد ہی اچھا پہلو بھی ہے جو اِس کے بند ہونے کے بعد ہی فوری طور پر ظاہر ہونے لگے گا۔ وہ ایسے کہ جن اداروں میں ملازم انٹرنیٹ کی مدد سے کام کرتے ہیں وہ کیا دن بھر ہی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہیں گے؟ نہیں ہرگز نہیں، اُن ملازموں کو فوراً کہا جائے گا کہ اب سارا کام اپنے ہاتھوں سے کیجئے اور اُنھیں پھر اپنے ہاتھوں کے ذریعہ کام کرنا ہوگا اور یہ بہت بڑا فائدہ مند ہے۔ کیونکہ جب انٹرنیٹ نہیں تھا تو لوگ اپنے ہاتھوں سے ہی تمام کام انجام دیتے تھے، پھر وہ کسی بھی ادارے کے کیوں نہ ہوں۔ انٹرنیٹ نے اگر تمام کاموں کو سہل بنادیا ہے اور کام کے سہل ہوجانے سے انسان سست و کاہل بھی بنتا گیا اور آج اِتنا کاہل بنا ہوا ہے کہ اُسے Downloading کی طرح 5G کی رفتار (Speed) سے تمام کام چاہئے وہ بالکل انتظار نہیں کرنا چاہتا۔ پہلے ہاتھوں سے لکھنا پسند کرتا تھا اور اب ٹائپنگ (Typing) کو اہمیت دیتا ہے، ہاتھ سے لکھا ہوا اُس کے ذہن میں محفوظ (Save) ہوتا تھا اور ٹائپ کیا ہوا Data صرف کمپیوٹر میں رہ گیا ہے۔

آخر میں یہی کہہ سکتے ہیں کہ انٹرنیٹ کا فائدہ سبھی اُٹھا رہے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ہے اس کا اِتنا زیادہ عام ہوجانا اور اِس کے جو نقصانات ہیں لوگ اُس پر اِتنا توجہ دینا لازمی نہیں سمجھ رہے ہیں جو آگے چل کر خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ ☆☆☆

Vietnam ki Jang-e-Azadi by Rashida Tasneem (Research Scholar
Dept. of Urdu Barkatullah University Bhopal)
راشدہ تسنیم (ریسرچ اسکالر شعبۂ اُردو، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال، ایم پی)

ویتنام کی جنگ آزادی

دوسری جنگ عظیم کے دوران جاپان نے ۱۹۴۰ء میں ویتنام پر قبضہ کرلیا، ایسی صورتِ حال میں اب قوم پرست اور وطن پرست ویتنامیوں کو فرانسیسیوں کے ساتھ ساتھ اُنھیں جاپانیوں کا بھی مقابلہ کرنا تھا۔ بعد میں ویتنیہ کے نام سے جانی گئی۔ ''لیگ فار دی انڈیپینڈینس'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اِس نے جاپانی قبضہ کا مناسب جواب دیا اور ستمبر میں ہنوئی ۱۹۴۵ء میں آزاد ہوا۔ اِس کے بعد جمہوری ویت نام کا قیام عمل میں آیا اور چی منہ اِس کا صدر مقرر ہوا۔

نئی جمہوری کو بہت سے چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد فرانسیسیوں نے باقی حصّہ کے شہنشاہ باؤ ڈائی کو کٹھ پتلی کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ملک پر قبضہ کرلیا۔ فرانسیسیوں کے حملہ کو پیش نظر ویتنام کے ارکان نے پہاڑی علاقوں میں پناہ لی۔ آٹھ سال کی لڑائی کے بعد فرانسیسیوں کو آخرکار Dienbienphu میں شکست ہوئی۔ فرانسیسیوں کی شکست کے بعد ۱۹۵۴ء میں جینوا میں ہونے والے امن مذاکرات میں ویتنامیوں کو ملکی تقسیم کا اختیار رہ گیا۔ شمالی اور جنوبی ویتنام دو الگ ملک بن گئے۔

ہو چی منہ اور کمیونسٹ شمالی حصّہ میں اقتدار میں آئیے جب کہ باؤدائی جنوبی ویتنام میں اقتدار میں آئے۔ اِس بٹوارے میں پورا ویتنام جنگ کے مورچے میں تبدیل ہوگیا۔

باؤدائی کے بعد Diem کی قیادت میں جابرانہ اور آمرانہ حکومت کے خلاف قومی آزادی نیشنل فرنٹ (NLF) کے نام سے ایک وسیع محاذ بنایا گیا۔ ہو چی منہ کی قیادت میں شمالی ویتنام حکومت کی مدد سے این ایل ایف نے ملک کے اتحاد کے لیے آواز اُٹھائی۔

☆☆☆

افسانے Afsane

Nai Tasveer by Vehshi Syed (Srinagar) cell- 94190012800
وحشی سعید (سرینگر)

نئی تصویر

میں یہ سوچ کر اپنے اسٹوڈیو میں داخل ہوا کہ آج میں ایک اور خوبصورت چہرے کی تصویر کاغذ پر اُتاروں گا۔ اُس کے جسم کے خدوخال کے ساتھ ساتھ اُس کی آنکھوں میں دبی ہوئی داستانوں کو برش کے حوالے کردوں گا۔ میں اپنے ان خیالات سے تب واپس آ گیا جب اسٹوڈیو کا دروازہ کھل گیا۔ اسٹوڈیو کا ماحول کھل اُٹھا اور اُس کی خوشبو سے سارا کمرہ مہک اُٹھا۔ وہ حسین ماہ جبین بولی :

''اب تصویر بناؤ ۔ ۔ !''

لڑکی کی سریلی آواز مجھے تصور کی دنیا سے واپس لائی۔ کینوس ایزل پر چڑھ گیا تھا، اب صرف رنگوں کو پھیلا دینا تھا۔ اور ۔ ۔ اب ماڈل گرل بھی تیار تھی۔

وہ دراز قد کی پتلی سی لڑکی بہت گوری بھی نہیں تھی، لیکن اُس کے نقوش بڑے تیکھے تھے۔ سڈول جسم پانچ چھ سو روپے کی ساڑی میں بند تھا۔

میں نے لکیروں کا انداز پکڑا۔ لکیروں نے عجیب مگر بہت زیادہ پرکشش پیچ وخم اختیار کئے۔

''میں فنکار ہوں۔ حسن کی تعریف کرنا میری فطرت ہے'' ۔ ۔ میں نے لڑکی سے کہا۔ لڑکی کے چہرے پر تبسم پھیل گیا، مگر بہت جلد اس پر سنجیدگی واپس آ گئی۔ اُس نے مختصر سا جواب دیا :

''میں ماڈل گرل ہوں''

''لیکن حسین تو ہو ۔ ۔ !''

''وقت ضائع مت کرو، ورنہ خرچ کرتے رہو گے اور خود بھوکے رہو گے''

''تم ہر بات کاروبار کے ترازو میں کیوں تولتی ہو ۔ ۔ ؟''

اُس نے مسکراتے ہوئے کہا :

''کیونکہ میں ماڈل گرل ہوں اور میری اُجرت فی گھنٹہ ہزار روپے ہے''

''لیکن اس سے تمہارا کیا نقصان ہے ۔ ۔ ؟''

''نقصان ہے، ورنہ میں تمہیں کیوں ٹوکتی۔ مثال کے طور پر تصویر پانچ گھنٹے میں مکمل ہوجائے گی اور چھ ہزار روپے میں فروخت ہوگی۔ تمہیں نفع ہوگا، مگر یہی تصویر اگر پانچ کے بدلے دس گھنٹے میں تیار ہو، پھر چھ ہزار میں فروخت ہوتو تمہیں بھی نقصان اور مجھے بھی۔ تمہارا کاروبار ٹھپ ہوگا۔ میری آمدنی کا یہ سلسلہ بھی بند ہوگا۔ بتاؤ، اس طرح میرا نقصان ہوگا نا ۔ ۔ !''

یہ ایک اچھا کاروباری نکتہ تھا۔ لیکن میں مصور ہوں، کوئی کاروباری نہیں۔ حالانکہ غم اور مجبوریوں کے دلدل میں پھنسا ہوا ہوں، پھر بھی آنکھیں کھولنے کے لئے تیار نہیں ہوں، ایک اندھی دوڑ دوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

میں نے کہا :

''تم نے کبھی پیار کیا ہے ۔ ۔ ؟''

''پیار کے لئے فرصت ہونی چاہئے مسٹر ۔ ۔ !''

''مجھ جیسی ماڈل گرل کی دنیا بے حس ہوتی ہے۔ ہمارے دل میں دھڑکن پیدا نہیں ہوتی۔ وقت کی تند اور تیز ہواؤں نے اس کو پتھر بنا دیا ہوتا ہے۔ افلاس کی چھاؤں بڑی ظالم ہوتی ہے''

میں نے سوچ کر کہا :

''دنیا کے حوادث انسان کو تبدیل کر دیتے ہیں، ذہنوں کو تبدیل کر دیتے ہیں، زندگی کے رُخ کو موڑ دیتے ہیں مگر پھر بھی آدمی دل کے سہارے حیات کی لمبی دوڑ طے کر لیتا ہے۔ بے حس دل والے بت بن کر رہ جاتے ہیں۔ وہ زمانے کے ہاتھوں کھلونا بن جاتے ہیں''

ماڈل گرل مجھے تکنے لگی :

''تم تصویر بناؤ''

اب اُس کی آواز میں بے چینی تھی، اضطراب تھا، کشمکش تھی۔ وہ وقت کے ہاتھوں بت بنی ہوئی ماڈل گرل تھی، صرف ماڈل گرل۔ میں نے ہاتھ میں پنسل سنبھالی۔ کاغذ پر میرا ہاتھ تیزی کے ساتھ چلنے لگا۔

''تمہارا نام ۔ ۔ !''

''ماڈل گرل''

''لیکن جب ماڈل گرل کے قالب سے آزاد ہوتی ہو، تب تمہارا نام کیا ہوتا ہے؟''

''وہ نام ۔ ۔ ؟'' ۔ ۔ وہ مسکرا پڑی۔

''آشا ۔ ۔ جس کی ساری زندگی نراشا کا شاہکار بن کے رہ گئی ہے''

''یہ سوچنے کا ڈھنگ ہے۔انسان خود احساس کمتری میں مبتلا ہوتا ہے۔اپنی دماغی اُلجھنوں سے خود ہی ایسا جال تیار کر لیتا ہے کہ خود کو اس جال میں بے بس اور بے کس پاتا ہے''

وہ خاموش رہی۔وہ کچھ سوچ رہی تھی۔میں بھی کچھ سوچ رہا تھا مگر سوچ کے زاویے مختلف تھے۔ زندہ رہنے کے مختلف انداز تھے۔

مادیت نے ہماری زندگی میں زہر بھر دیا ہے۔وقت کی غلامی نے زندگی سے آرام ختم کر دیا ہے۔ زندگی کی حرارت میں سردی بھر دی ہے۔ذہن غلام،سوچ غلام،زندگی غلام ۔ ۔ سب مادیت کے غلام بن گئے ہیں۔

لیکن ۔ ۔ میں کب تک سوچتا رہوں گا۔میں نے ایک دفعہ پھر پنسل اُٹھائی اور تصویر بنانے میں محو ہوا،لیکن ہاتھ قابو سے باہر،خود بخود کاغذ پر لکیریں کھینچتے جا رہے تھے۔میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر میرا ہاتھ پرایا کیوں بن گیا،اور پھر ایک ایسی تصویر بنی جس کا تصور تک میرے ذہن میں نہیں تھا۔میں نے آشا سے کہا :

''تصویر نہیں بن سکتی۔تم جا سکتی ہو''

میں نے تصویر پھاڑنے کے لئے اُٹھائی۔آشا نے میرا خیال پڑھ کر کہا :

''تم تصویر نہیں پھاڑ سکتے''

میں نے اُس کے جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا :

''تم پیسے لو اور جاؤ''

''میں تصویر دیکھنا چاہتی ہوں''

''تصویر نہیں بنی''

''جھوٹ بولتے ہو''

''ہاں ہاں میں جھوٹ بولتا ہوں'' ۔ ۔ میں چیخ پڑا۔

''لیکن مجھے یہ جھوٹ بولنے دو۔یہ جھوٹ اُس تلخ سچائی سے بہتر ہے جو دل کو ٹھیس لگا دے''

آشا تھوڑی دیر خاموش رہی،پھر میرے ہاتھ سے تصویر لے کر بڑبڑائی :

''میرے جسم پر کوئی کپڑا نہیں۔میں ننگی ہو گئی،لیکن ۔ ۔ کیوں ۔ ۔ کیوں تمہارے قلم نے

مجھے ننگا کیا، برہنہ کیا ۔ ۔ بتاؤ؟''

میں بوکھلا گیا۔کوئی جواب نہ بن پڑا۔

''مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔ میں نے لاکھ چاہا کہ قلم کو لگام دوں، قبضے میں رکھوں لیکن وہ بے قابو ہوگیا۔میرے اختیار میں نہیں رہا''

وہ سوچ میں کھوگئی ۔ میں اپنی حکمت پر نادم تھا۔قلم دھوکا دے گیا۔حقیقت پوشیدہ نہیں رکھی جاسکتی۔اس کو لاکھ بہکاؤ مگر بہک نہیں سکتی۔میں اس سوچ میں محو تھا :

''اب ۔ ۔ اب میں کیا کروں؟''

آشا کی آواز آئی :

''مجھے برہنہ ہونے سے بچاؤ''

میں نے طنزیہ آواز میں کہا :

''محبت پر تمہیں یقین نہیں ہے''

آشا نے مایوس آواز میں کہا :

''لیکن ۔ ۔ !''

میں نے ہنستے ہوئے کہا :

''تم تو کب کی ننگی ہوگئی''

اب آشا نے اعتماد بھری آواز میں کہا :

''لیکن تمہارے دل میں محبت ہے نا ۔ ۔ تم فنکار ہونا''

میں کچھ نہ کہہ سکا۔بطور اعتراف میرا سر جھک گیا، پھر اُس کے ہاتھ سے تصویر لی ۔ ۔ اور ۔ ۔ اب تصویر برہنہ نہیں رہ سکتی تھی۔

☆☆☆

Rishte Naye Purane by Noor Shah (Srinagar) cell-9906771363
نورشاہ (سرینگر)

رشتے نئے پرانے

آمنہ کی صورت دیکھ کر میری اور احمد کی آنکھیں جیسے پتھرا گئیں۔ اُس کی آنکھوں میں ایک پوری جھیل پوشیدہ تھی..... ایک خاموش ساکن جھیل.....!!

''میں نے اخبار میں آپ کا اشتہار دیکھا..... اور اب..... اب میں بچی کو دیکھنا چاہوں گی''

''مگر.....!''..... احمد نے بات کاٹتے ہوئے کہا..... ''آپ اور خادمہ کا کام، میرا مطلب نرسنگ سے ہے''

جی ہاں..... خادمہ یا نرس..... کچھ بھی سمجھ لیجئے۔ مگر میری ایک شرط بھی ہے''

''شرط!..... وہ کیا؟''..... میں نے پوچھا۔

''بچی خوبصورت ہو، صحت مند ہو، تب ہی.....!''

''ماشاءاللہ ہماری بچی خوبصورت ہے اور صحت مند بھی''

''کہاں ہے آپ کی بچی.....؟''

''دوسرے کمرے میں سو رہی ہے۔ لیکن یہ جگہ شہر سے کافی دور ہے اور پھر یہاں ہمارے بغیر اس مکان میں کوئی اور نہیں رہتا۔ آس پاس ہمارے سیب کے باغات ہیں۔ اُن کی دیکھ بھال کے لئے چھ لوگ کام کرتے ہیں۔ لیکن شام اُترنے سے پہلے ہی چلے جاتے ہیں۔ ہم نے اُن کے رہنے اور کھانے پینے کے لئے دو کمرے بنا رکھے ہیں جو ہمارے گھر سے کافی دوری پر ہیں۔ ہمارے باغات کے دوسری جانب ہمارے گھر میں اُن کا کوئی آنا جانا نہیں ہے''

''میں بھی تنہا پسند ہوں۔ آپ کے ہاں کون کیا کام کر رہا ہے، مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ میرا واسطہ صرف آپ کی بچی سے ہوگا۔ اُس کی دیکھ بھال..... اُس کے تعلق سے میں ہر کوئی کام کرنے کے لئے تیار ہوں..... مگر.....!''

''مگر کیا.....؟''

''بچی کو دیکھنا چاہوں گی، آپ کو ہاں کرنے سے پہلے''

''میں اور احمد دوسرے کمرے میں آ گئے جہاں ہماری ایک سال کی بنٹی سو رہی تھی۔ آمنہ بھی میرے ساتھ ہی تھی۔ بنٹی کو دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی اور بے ساختہ اُس کے منہ سے نکل گیا.....

''میں آپ کے ہاں کام کروں گی۔ آپ کی بچی کی دیکھ بھال کروں گی''

شاید رشتوں کی ایک نئی کہانی وجود میں آ رہی تھی۔ بنٹی آمنہ سے مانوس تو ہونے لگی لیکن آمنہ بنٹی کے علاوہ کسی سے مانوس ہوتے نظر نہیں آ رہی تھی۔ گھر میں میرے اور احمد کے بغیر ہوتا ہی کون تھا۔ احمد تو اکثر باغوں کی دیکھ بھال کے سلسلے میں گھر سے صبح سویرے چلے جاتے اور شام اُترنے سے پہلے لوٹ آتے تھے۔ گھر میں اکثر تنہا ہوتے ہوئے بھی وہ مجھ سے دور دور رہتی تھی۔

شب و روز گزرتے رہے، شام و سحر بدلتے رہے۔ ایک رات میں اور احمد اُس کے بارے میں باتیں کرتے رہے کہ آخر وہ اتنی اُداس، اتنی خاموش اور اتنی افسردہ کیوں رہتی ہے.....؟ بنٹی کے علاوہ ہم سے دور کیوں رہتی ہے؟ آخر کیا روگ ہے اُسے، کیا دُکھ ہے اُسے.....؟ شاید ہماری سوچوں کو اُس کی خاموشی نے گھیر رکھا تھا۔ یہ خاموشی بھی کبھی کبھی ایک روگ بن جاتی ہے۔

لیکن ایک رات اور نہ جانے اُس رات کا کون سا لمحہ تھا کہ ایک میٹھی سریلی سی آواز اُبھری۔ کوئی وائلن بجا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے ایک میٹھا سا درد بھرا راگ اُبھر رہا تھا۔ احمد نے اُٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ مجھے اشارہ کیا۔ میں احمد کے قریب آئی۔ وائلن کی آواز آمنہ کے کمرے سے آ رہی تھی۔ ہم دونوں بے ساختہ اُس کے کمرے کی جانب جانے لگے۔ آمنہ کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ ہم آہستہ آہستہ بے آواز قدموں سے کمرے میں ایک طرف رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ہم سے بے خبر وہ کافی دیر تک وائلن بجاتی رہی۔ وائلن کی آواز میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ ہمیں محسوس ہونے لگا کہ ہم دونوں جیسے گونگے ہو گئے ہوں۔ پھر اچانک اُس نے وائلن بجانا بند کر دیا اور اُسے فرش پر زور سے پھینک دیا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔

''آمنہ.....'' میں نے آہستہ سے کہا۔

وہ چونک پڑی۔ جیسے سپنے میں اُسے کسی سانپ نے ڈس لیا ہو۔

''کون ہے.....؟''

''میں ہوں آمنہ.....''

''میں اس وقت سونا چاہتی ہوں''

''ہم خاموشی سے کمرے سے باہر آ گئے''

دوسری صبح جب احمد اپنے باغوں کی جانب چل پڑا، تو آمنہ میرے کمرے میں آئی۔ اُس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ شاید وہ رات بھر سو نہیں پائی تھی۔

''مجھے کل کے رویے پر افسوس ہے''

''بیٹھو''..... میں نے کہا۔

اور جب وہ بیٹھ گئی، میں نے آہستہ سے کہا.....

''آمنہ میں جاننا چاہتی ہوں کہ تمہیں کون سا دکھ ہے.....؟ مجھے بتاؤ..... ایک عورت ہونے کے ناطے، ایک بہن کی طرح..... آخر تمہاری اس خاموشی کا کوئی پس منظر تو ہوگا.....''

آمنہ خاموش رہی۔

''کیا تم شادی شدہ ہو.....؟''..... میں نے پھر بات چھیڑ دی۔

''شادی.....!''..... وہ چونک پڑی۔

''مجھے مرد ذات سے نفرت ہے''

''نفرت.....!''..... میں نے آہستہ سے کہا۔

''یہ میرا سوال نہیں ہے۔ میں نے نفرت اور محبت کے بارے میں تم سے پوچھا ہی نہیں۔ صرف اتنی سی بات پوچھی کہ کیا تم شادی شدہ ہو.....؟''

''نہیں''..... اُس نے مختصر جواب دیا۔

''کیا تمہارے گھر میں کوئی اور بھی نرسنگ کا کام کرتا ہے''

''دیکھئے مجھے بنٹی سے بے حد لگاؤ ہے، پیار ہے۔ میں اُس کی بہتر ڈھنگ سے دیکھ بھال کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ خدارا مجھے اُس سے جدا نہ کیجئے۔''

''نہیں آمنہ..... تم نے مجھے غلط سمجھا۔ بنٹی اب تم سے کافی مانوس ہو چکی ہے۔ اُس کو تمہاری اُتنی ہی ضرورت ہے جس قدر تمہیں اُس کی''

اتنے میں بنٹی کے رونے کی آواز سنائی دی اور آمنہ اُٹھ کر چلی گئی۔

پھر میں نے اور احمد دونوں نے خاموشی اختیار کی۔

لیکن اُس رات ایک عجیب سے اَن ہونی ہوگئی۔ رات گئے آمنہ کے کمرے سے بنٹی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ میں کچھ دیر خاموش رہی کہ شاید آمنہ بنٹی کو چپ کرانے میں کامیاب ہو جائے، مگر ایسا

نہ ہوسکا۔ جب بنٹی نے چلا چلا کر رونا شروع کیا تو احمد بھی نیند سے جاگ گیا۔ ہم دونوں آمنہ کے کمرے کی جانب چلے گئے۔ میں نے جلدی سے بنٹی کو گود میں اُٹھایا۔ کمرے میں آمنہ فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اُس کا وائلن ایک طرف پڑا تھا۔ وائلن کے تار ٹوٹ چکے تھے۔

اُس نے آنکھوں سے اپنے ہاتھوں کی جانب اشارہ کیا۔ اس کے دونوں ہاتھ بے حس ہو گئے تھے۔ میرے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ احمد ایک ہی جگہ ساکت ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ وہ حیران تھا کہ اتنی خوبصورت اور جوان لڑکی کے ہاتھ بے حس کیسے ہو سکتے ہیں..... کیوں، کیسے.....!

''میں ڈاکٹر خالد کو فون کرتا ہوں''..... احمد نے کہا۔

دفعتاً آمنہ بول اُٹھی.....

''نہیں..... اچھا ہی ہوا کہ میرے دونوں ہاتھ ہمیشہ کے لئے بیکار ہو گئے۔ یہ اسی قابل تھے۔ آپ نہیں جانتے، کوئی نہیں جانتا کہ میرے ان ہاتھوں سے ایک معصوم بچی کا خون ہوا ہے''۔

''یہ کیسی باتیں کر رہی ہو آمنہ.....؟ شاید تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے''

جب صبح ہوئی تو ڈاکٹر خالد آ گئے۔ اُنہوں نے معائنہ کیا اور کہا

''آمنہ کو کوئی زبردست صدمہ پہنچا ہے''

چند روز بعد ڈاکٹر خالد کا فون آ گیا۔ اُنہوں نے آمنہ کو ہسپتال لانے کے لئے کہا۔

''ان دنوں یہاں ایک جرمن ماہر نفسیات آئے ہوئے ہیں۔ اُن کے لئے آمنہ کا کیس بڑا دلچسپ رہے گا''

اور پھر ایک دن ڈاکٹر خالد پوری کہانی سن کر ہمارے گھر چلا آیا.....

''آمنہ ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئی ہے۔ اپنے ماں باپ کی بڑی لیکن اپنی دو چھوٹی بہنوں سے زیادہ خوبصورت اولاد ہے۔ ماں تپ دِق کی مریضہ ہے۔ باپ کو شراب کی لت پڑی ہے۔ کام کاج میں دلچسپی نہیں۔ اس لئے گھر کی ساری ذمہ داری آمنہ نے کندھوں پر ہے۔ ماں بھی آمنہ سے اپنی دوسری بیٹیوں سے زیادہ پیار کرتی تھی۔ لیکن جب اُن کے ہاں ایک اور بیٹی پیدا ہوئی تو ماں کی شفقت میں تبدیلی آ گئی۔ آمنہ کے حصے کی ساری شفقت اب نوزائد بچی کے حصے میں چلی گئی۔ اس سے عجیب سا ماحول پیدا ہو گیا۔ جب باپ کو شراب کے لئے پیسے نہیں ہوتے تو وہ آمنہ کو پیٹنا شروع کر دیتا تو

چھوٹی بہنوں کو وقت پر کھانا نہ ملتا تو وہ روٹھ جاتیں۔ ماں کو وقت پر دوائی نہ ملتی تو وہ بہت غصہ کرتی۔ اُس کی شفقت شاید اب نفرت میں بدل چکی تھی۔

گھر کے اس ماحول سے آمنہ کو نفرت ہوگئی اور ایک دن وہ اپنے گھر سے ہی بھاگ گئی۔

''اور اُس کے بعد یہاں آ گئی، ہمارے ہاں.....!''..... احمد نے پوچھا۔

''نہیں، یہاں نہیں..... کسی اور گھر میں..... ایک معصوم سی بچی کی پرورش کرنے لگی۔ اور پھر ایک دن وہ بچی مر گئی۔ گھٹن کی وجہ سے..... اور پھر آمنہ یہاں چلی آئی''

''لیکن اس میں آمنہ کا کیا قصور.....؟''..... میں نے پوچھا۔

''اُس کا کہنا ہے کہ جب وہ اُس بچی کو دیکھتی تو اُسے اپنی نوزائد بہن یاد آجاتی جس نے آمنہ کو نفرت سے آشنا کیا تھا۔ وہ جس قدر اُسے بھول جانے کی کوشش کرتی وہ اُتنی ہی زیادہ اسے یاد آتی۔ اور پھر ایک رات اُس نے جنونی کیفیت میں اُس بچی کو گھٹن سے ہمیشہ کے لئے سلا دیا''۔

مجھ سے رہا نہ گیا اور میں چیخ پڑی.....

''میرے اللہ! کہیں ایک دن وہ بنٹی کو بھی اسی طرح ہمیشہ کے لئے نہ سلا دے''

''اور پھر وہ یہاں آ گئی، آپ کا اشتہار دیکھ کر''..... ڈاکٹر خالد بولے جا رہا تھا۔

''اُسے بخوبی اپنی کمزوری کا علم تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کسی بھی لمحے میں ماضی کا عمل دہرا سکتی ہے۔ بنٹی کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند کر سکتی ہے..... لیکن وہ بنٹی کو چاہنے لگی تھی۔ ایک طرف محبت اور دوسری طرف خوف اور نفرت''

''اور ایک رات اُس پر جنون سوار ہو گیا۔ اُس نے وائلن بجانا چاہا، لیکن وایلن کے تار ٹوٹ چکے تھے اور سامنے بنٹی سو رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں خونی چمک آ گئی اور اُس کے ہاتھ بنٹی کا جانب بڑھنے لگے۔ وہ وہی کرنے جا رہی تھی جس کا اُسے ڈر تھا۔ اچانک اُس کے ہاتھ ساکت ہو گئے۔ اُس کے دل نے شاید پہلی بار اُس کے دماغ پر قابو پا لیا تھا۔ محبت نفرت پر غالب آ چکی تھی''۔

بنٹی جاگ چکی تھی اور آمنہ کے گود میں جانے کے لئے مچل رہی تھی، لیکن آمنہ.....!!''

☆☆☆

Doosra Shauhar by Dr. Nazeer Mushtaq(MBBS) Srinagar
ڈاکٹر نذیر مشتاق (سرینگر) cell-9149984865, 9419004094

دوسرا۔شوہر۔۔۔۔

ڈاکٹر صاحب آپ نے میرے شوہر کو مار ڈالا۔۔۔اس نے مجھ سے کہا اور میرے ردعمل کا انتظار کرنے لگی۔۔۔میں نے باہر کی طرف دیکھا میرے مطب کی کھڑکی کے بالکل قریب بوڑھا چنار اداس تھا ایک شاخ پر ایک اکیلی چڑیا پھدک رہی تھی۔جانے مجھے کیوں ایسا لگا کہ وہ بڑی دیر سے اپنے ہمسفر کو تلاش کر رہی ہے۔میں نے سامنے میز پر رکھے ہوے مگ سے گرین ٹی کی ایک چسکی لی اور سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی عورت کی طرف دیکھا جو میرے جواب کا بیصبری سے انتظار کر رہی تھی۔۔۔۔۔۔ابھی میرے لب وانہیں ہوے تھے کہ اس نے پھر سے کہا۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر صاحب آپ نے میرے شوہر کو مار ڈالا۔۔۔۔۔۔میں نے اسے غور سے دیکھا وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔۔اس نے ہلکے گلابی رنگ کا پھرن اور اسی رنگ کا شلوار پہنا تھا اور اسی رنگ کا دوپٹہ گلے میں لٹکایا تھا۔بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل لگانے سے اس کی آنکھیں اور بھی خوبصورت اور نشیلی ہوگئیں تھیں۔اس نے چہرے پر بڑی مہارت سے میک اپ کیا تھا اس کے گال دہک رہے تھے اور لبوں پر عجیب سی نمی تھی۔۔اس کی ناک بہت پیاری اور خوبصورت تھی اس نے دایں ھاتھ میں رکھے رومال سے نتھنوں کی نمی کو صاف کیا اور میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔۔۔۔۔۔اب میں نے کچھ کہنا ضروری سمجھا۔۔۔۔۔

ہوں تم مجھ پر الزام لگا رہی ہو کہ میں نے تمہارے شوہر کو مار ڈالا۔۔۔مگر سچ تو یہ ہے کہ میں نے تو صرف تم کو گولیاں دیں۔۔۔۔۔۔اور ان ہی گولیوں سے وہ مر گیا۔۔۔اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔۔۔۔۔اور تم ہمیشہ کے لیے آزاد ہوگیئں۔۔۔۔میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔۔مگر میں تو اس کے بغیر رات بھر تڑپتی رہتی ہوں۔۔۔وہ آتا تو میری رات حسین ہو جاتی اور میں۔اس کی باہوں میں سب کچھ بھول جاتی۔۔اس نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔۔۔۔اب میں بالکل اکیلی ہوگئی ہوں اب میں کیا کروں۔۔۔۔اس نے ترچھی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔۔۔۔میں نے اس کی

کیس ہسٹری کھول کر پڑھنا شروع کیا۔۔۔دیکھو جو کچھ تم نے ایک مہینے پہلے مجھ سے کہا وہ سب تفصیل سے اس فایل میں درج ہے تم نے جو کچھ کہا اسی حساب سے میں نے تمہارے لئے دوایاں تجویز کیں۔۔۔۔کیا لکھا ہے اس میں۔۔۔۔اس نے یوں کہا جیسے کسی معصوم بچے نے سوال کیا ہو۔۔۔۔میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔۔۔تم سننا چاہتی ہو۔۔۔۔۔۔۔اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے گھٹنوں پر رکھے چھوٹے سے خوب صورت بیگ میں سے چیونگ گم نکال کر منہ میں ڈالا اور اسے چبانے لگی۔۔۔۔اس میں لکھا ہے۔۔۔۔میں نے اس کی ہسٹری پڑھنا شروع کی۔۔۔۔۔ڈاکٹر صاحب میں ہر وقت بے قرار رہتی ہوں۔۔۔جی چاہتا ہے کہ چیخوں چلاؤں اور کہیں دور چلی جاوں مگر جب حسین رات کا خیال آتا ہے تو رک کر رات کا انتظار کرنے لگتی ہوں۔۔۔۔مجھے اپنی ماں سے سخت نفرت ہے وہ عورت نہیں ایک سانڈنی ہے۔۔۔وہ بچپن ہی سے مجھے گالیاں اور بد دعائیں دیتی رہی ہے۔۔۔۔جب میں کسی کام میں زرا دیر لگاتی تو وہ۔چلا کر کہتی۔۔۔تو دیکھ تیری شادی میں کسی جن سے کرواؤں گی وہ تیری ہڑیاں توڑا کرے گا اور۔۔۔۔میں اس کی بات کاٹ کر کہتی۔۔۔کیا جن مجھ سے شادی کرے گا۔۔۔۔تو وہ جواب دینے کی بجائے جھاڑو ہاتھ میں لیے میرے پیچھے دوڑتی۔۔میں تیزی سے بھاگ جاتی اور وہ تھوڑی دیر میرا تعاقب کر کے ہانپنے لگتی کیوں کہ وہ دمہ کی مریض تھی۔ وہ۔بیٹھ جاتی اور گالیاں بکنے لگتی۔۔۔۔میرا باپ اس کے سامنے اف بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ آرمی والوں کے ساتھ کام کرتا تھا۔مختلف بینکروں میں جا جا کر پٹرول اور ڈیزل جمع کرتا اور ملاوٹ کر کے بیچتا تھا۔۔۔۔ایک دن وہ گھر سے نکلا پھر کبھی واپس نہیں آیا۔۔۔۔اس کے بعد میرے بڑے بھائی نے گھر کی بھاگ ڈور سنبھالی۔۔۔۔ماں بھی ایک پرائیویٹ اسپتال میں خاکروب کا کام کرنے لگی۔میرا بھائی کیا کام کرتا تھا یہ مجھے کبھی معلوم نہیں ہو سکا میں اس سے چھوٹی تھی اس لیے وہ مجھ سے بہت پیار کرتا تھا میرے لیے میری پسند کے کپڑے اور چوڑیاں لاتا مجھے رنگ برنگی کپڑے بہت پسند تھے اور آج بھی ہیں مجھے سونے کے زیورات بہت پسند ہیں اور اسی لیے میں نے دیکھو کتنے زیورات پہنے ہیں۔۔مگر کسی سے کہنا نہی یہ سب نقلی زیورات ہیں۔۔مگر مجھے دکھاوا بہت اچھا لگتا ہے۔۔۔میرے بھائی کو میری شادی کی فکر ہر وقت لاحق رہتی تھی اس لیے اس نے کم عمری میں ہی میری شادی اپنے ایک دوست سے کروادی۔۔۔۔۔وہ کیا کام کرتا تھا مجھے کسی نے نہیں بتایا مگر میری ماں اکثر اس سے پوچھا کرتی۔۔۔۔بیٹا تم کیا کام کرتے ہو وہ مسکراتے ہوئے جواب دیا کرتا۔۔۔۔ماں جی میں ایک

پرائیویٹ فرم می منیجر کے عہدے پر فائز ہوں۔۔۔۔میری ماں سر جھکا کر اسے دعائیں دیتی۔۔۔۔

مجھے اس بات کی زرہ بھی پرواہ نہیں تھی کہ وہ کیا کام کرتا تھا۔میں خوش تھی کہ وہ ہر طرح سے میرا خیال رکھتا تھا اور میری ہر فرمایش پوری کرتا۔۔۔۔۔میں اپنی مرضی کی مالک تھی۔۔میں ماں سے ملنے کبھی نہیں جاتی وہ کبھی کبھی مجھ سے ملنے اتی۔۔میں گھر میں اکیلی تھی کیونکہ میرے شوہر کے سبھی رشتہ دار ایک دور دراز گاؤں میں رہتے تھے اور میں کبھی ان سے ملنے نہیں جاتی تھی۔۔۔۔۔۔۔

ایک دن مجھ پر یہ خبر قہر بن کر ٹوٹ پڑی کہ میرا بھائی ایک انکاؤنٹر میں مارا گیا ہے۔۔۔۔اسی دن مجھے معلوم پڑا کہ وہ ایک ملیٹنٹ تھا۔۔۔۔۔۔میری کمر ٹوٹ گئی اور میری ماں بھی اکلوتا بیٹا کھونے کے غم میں ادھ مری ہوگئی۔۔۔۔۔۔۔میں نے اسے اپنے پاس بلایا اور وہ خوشی خوشی اگیی۔۔۔۔۔۔میرا شوہر کام پر جاتا۔ماں گھر کا کام کرتی اور میں اپنی آرایش وزیبایش میں مصروف رہتی میں شام تک شوہر کا انتظار کرتی کہ کب آیے اور مجھے اپنی باہوں میں جکڑ کر ادھ موا کردے۔۔۔۔۔۔میرے شوہر نے ایک چھوٹا سا مکان خرید لیا تھا۔۔۔۔۔میرا بیڑ روم دوسری منزل پر سامنے کی طرف تھا۔اس کا ایک دروازہ ورنڈا پر باہر کی طرف کھلتا تھا اور دروازے کے قریب ایک سیڑھی تھی جس کے ذریعے میں باغ میں اترتی اور واپس چڑھتی۔۔۔۔ماں نچلی منزل کے ایک کمرے میں رہتی تھی

میرا شوہر رات کو دیر سے آتا کھانا کھانے کے بعد سیدھا بیڑ روم میں چلا جاتا اور میں ماں کو چھوڑ کر دوڑتی ہوئی اس کے پاس جاتی اور اسے گلے لگاتی میرے اندر ایک عجیب سی آگ بھڑک اٹھتی اور میی فوری وہ آگ بجھانا چاہتی۔۔وہ میری بیتابی سمجھ جاتا اور پلک جھپکتے ہی مجھے اپنی باہوں میں جکڑ لیتا میں آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو اس کے حوالے کرتی۔۔۔۔۔۔میرے لیے اب۔اس کے ساتھ رات گزارنا ایک نشہ بن چکا تھا اور میرا دل چاہتا کہ اس نشے کی مقدار میں ہر رات اضافہ ہوتا رہے۔۔۔۔۔۔میں خوشی خوشی زندگی کے شب وروز گزار رہی تھی۔۔۔۔۔۔پھر ایک شام وہ گھر لوٹا ہی نہیں۔۔۔۔میی اپنی ماں کی گود میں سر رکھے آنسو بہاتی رہی۔۔۔۔۔۔۔دن رات گزرے مگر وہ نہیں آیا۔میری ماں پولیس اسٹیشن بھی گیی مگر اس کا کوی پتہ نہیں چلا۔۔۔۔۔اب میں اکیلی تھی ماں میرے پاس تھی مگر وہ میری ضرورت پوری کیسے کرتی۔۔۔۔میں اپنے ہی بیڈ روم میں راتیں گزارتی مگر نیند مجھ سے روٹھ چکی تھی میں رات بھر صرف اپنے شوہر کے بارے میں سوچتی رہتی۔۔۔میرا دل ایک لمحہ بھی اس کی یاد سے غافل نہیں رہتا۔۔۔۔میں پوری رات اس کی جدائی کی آگ میں جلتی

رہتی۔۔۔۔۔ایک رات میں اس کی یادوں میں۔کھوی ہوی تھی۔۔۔۔۔میں چاہتی تھی کہ وہ اے اور مجھے اپنی باہوں میں زور سے جکڑ لے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اچانک بادل گرجنے لگے اور بجلی چمکی۔میں گھبرا گئی۔۔۔۔اچاںک مجھے ایسا۔لگا جیسے کوئی سیڑھی کے پاے چڑھنے لگا۔۔۔۔دھیرے دھیرے۔ میں سہم گیی۔۔۔۔اچانک ورنڈا کی طرف کا دروازہ کھلا اور وہ اندر ایا۔سفید برف جیسے لباس میں ملبوس۔دراز قد وقامت۔نورانی چہرہ۔۔۔۔۔۔اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔۔۔گھبراومت میں تمہارا شوہر ہوں

ہمارا نکاح ہو چکا ہے اب میں ہر رات تمہارے پاس آیا کروں گا

یہ سن کر میں سب کچھ بھول گئی اور میں نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کیا۔۔۔۔۔۔اس نے مجھے اپنے گلے سے لگایا اور پھر اذان ہونے تک وہ میرے ساتھ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ازان سنتے وہ اٹھا۔۔۔باتھ روم گیا اور نہا دھو کر۔لباس زیب تن کر کے اسی دروازے سے باہر چلا گیا جہاں سے آیا تھا۔۔۔۔۔اب یہ معمول بن گیا وہ رات گزارنے میرے پاس اجاتا اور پو پھٹتے ہی چلا جاتا۔۔۔۔میری راتیں بہت حسین ہیں مگر دن قیامت سے کم نہیں ہیں۔۔میری بھوک مر چکی ہے۔۔کسی بھی کام میں دل نہیں لگتا ہر وقت غصے کی آگ میں جلتی رہتی ہوں جس کا شکار بیچاری ماں ہوجاتی ہے

مجھے گھر سے باہر جانا بالکل اچھا نہیں لگتا ہے.جی چاہتا ہے روؤں چیخوں چلاؤں۔اپنے کپڑے پھاڑ کر ننگی ناچوں مگر دوسرے شوہر کی یاد اتے ہی سب۔کچھ بھول جانے کی کوشش کرتی ہوں۔۔۔۔میری ماں نے میری حالت دیکھ کر مجھے ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کا حکم دیا اور میں آپ کے پاس ای۔۔۔۔۔۔۔

میں نے پانی کا ایک گلاس حلق سے اتارا اور اس سے کہا۔۔۔یہ تمہاری ہسٹری ہے جو میں نے لکھ کے رکھی ہے۔۔۔۔میں نے تمہارے کچھ ٹیسٹ بھی کیے وہ سب نارمل ہیں۔۔تمہاری ہسٹری پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ تم ایک نفسیاتی مریض ہو۔۔میں نے دوایاں تجویز کیں اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

میرا دوسرا شوہر مر گیا۔۔۔مگر کیوں۔ وہی تو میری راتوں کا سہارا تھا۔۔ دوایوں نے اسے مار ڈالا۔۔۔مگر اب مجھے لگتا ہے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں مجھے کوی پرابلم نہیں ہے۔۔اس نے منہ سے چیونگم نکال کر دایں طرف رکھی ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔۔۔اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔۔۔۔اپ نے میرا علاج کیا مگر میرے شوہر کو کیوں مار ڈالا۔۔۔۔

میں نے اسے سمجھایا۔۔۔۔دراصل تمہارا کوئی دوسرا شوہر تھا ہی نہی۔وہ تمہارا بھرم تھا۔۔تمہارے لاشعور میں ماں کی بات چھپی تھی کہ تمہاری شادی جن سے ہوگی۔۔۔۔۔۔تمہارے شوہر کے لاپتہ ہوجانے کے بعد تمہارے دماغ میں جن کے متعلق خیال آیا ہوگا۔یا تم نے خواب دیکھا ہوگا۔۔۔اور وہی خیال یا خواب تمہارے خیالوں میں رات کے وقت حقیقت بن گیا ہوگا ڈاکٹروں کی زبان میں اسے Hallucinations کہتے ہیں۔۔جو کچھ تم نے رات کو دیکھا یا کیا وہ سب سراب تھا۔۔۔۔اسی لیے دوایوں سے تمہارے دماغ کے بگڑے ہوئے کیمیائی پیام رسان اپنی اصلی حالت میں واپس آئے اور تمہارا دوسرا شوہر غایب ہو گیا۔۔۔۔۔۔دراصل تمہارا کوئی دوسرا شوہر تھا ہی نہیں۔۔۔۔تم محض لاشعوری احساسات سے کام لے کر دوسرے شوہر کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتی تھیں۔۔۔تم کسی لیڈی ڈاکٹر سے اپنے مخصوص اعضاء کا معاینہ ضرور کروانا۔۔۔۔۔

میری۔باتیں سن کر وہ حیران و پریشاں ہوگئی۔۔۔۔۔وہ کرسی سے اٹھی۔ڈاکٹر اب میں تمہاری تجویز کی ہوی دوایاں استعمال نہیں کروں گی۔۔۔۔میرا دوسرا شوہر ضرور واپس آئے گا اور میری راتیں رنگین ہوں گی۔۔۔۔یہ کہھ کر وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔۔۔۔۔۔۔

☆☆☆

Kutta by Prof. Farkhanda Zameer(Ajmer) cell-
پروفیسر فرخندہ ضمیر (اجمیر)

کتا

شان اسکول سے ابھی تک نہیں ایا تھا۔ دو بج رہے تھے چھٹی ہوئے ایک گھنٹہ ہو گیا تھا۔ شہلا بے چینی سے دروازے کی طرف دیکھتی۔ اج شان کے اسکول کی ٹیکسی نہیں ائی تھی، اس لیے شیراز اسے چھوڑ کرائے تھے۔ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ شیراز گھبرایا ہوا تھا۔

''شہلا شان گھرایا کیا؟''

نہیں تو، کیوں وہ اپ کے ساتھ نہیں ہے؟ شہلا کا دل بیٹھنے لگا۔

''نہیں'' ہائے میرا بچہ، شہلا کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا۔

''شہلا شہلا'' شان چلاتا رہا۔ شہلا کا روتے روتے برا حال ہو گیا۔ اتنی دیر میں پاس پڑوس میں خبر لگ گئی۔ لوگ انے لگے۔ اسے دلاسہ دیتے، لیکن شہلا کو کسی پل قرار نہ تھا۔ ''ہائے بیچاری کے شادی کے پانچ سالوں بعد بڑی منتوں مرادوں سے بچہ ہوا تھا۔ عورتیں دکھی ہونے لگی۔

شیراز اپنے دوست روی کو لے کر تھانے پہنچا تو تھانے میں سناٹا پسرا ہوا تھا۔ ایک ایس ایچ او بیٹھا ٹیلیفون پر باتیں کر رہا تھا۔ شیراز، روی نے تھانیدار کو نمستے کیا۔ تھانیدار نے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شیراز اور روی بیٹھ گئے۔ شیراز پر ایک ایک پل بھاری گزر رہا تھا۔ دس منٹ ہو گئے کوئی توجہ نہیں۔ اخر شیراز کا صبر برداشت سے باہر ہو گیا۔ ''تھانیدار صاحب کیا اپ دس منٹ سے فون پر چپکے ہوئے ہیں، ہمیں بھی اٹینڈ کیجئے، مجھے رپورٹ لکھوانی ہے۔''

تھانیدار نے پھر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ شیراز کو غصہ ا گیا، ''کیا اپ چپ رہنے کا اشارہ کر رہے ہیں، میری جان پر بن رہی ہے، میرا بچہ کھو گیا ہے۔'' تھانیدار نے شیراز کے چلانے پر فون رکھا۔ ''کیا ہے، میں کیا کروں؟ تمہارا بچہ کھو گیا تو اپنے جاننیوالوں کے یہاں پتہ کرو'' تھانیدار نے کھیجتے ہوئے کہا۔

''وہی سب کرنے کے بعد اپ کے پاس ائے ہیں، اپ رپورٹ لکھتے ہیں یا نہیں''

''ہاں ہاں، لکھ رہا ہوں، دماغ خراب مت کرو، صبح سے ویسے ہی دماغ خراب ہے، پانی پینے تک کی فرصت نہیں، ہاں ، کیا عمر تھی بچے کی؟''

''چار سال'' پھر فون کی بیل بجی۔ پانچ منٹ پھر لگ گئے۔

''ہاں فوٹو لائے ہو''، جی ہاں، تھانیدار نے بے دلی سے رپورٹ لکھی۔ ''صاحب میرے بچے کو جلدی سے تلاش کروا دیجئے، نہ جانے میرا بچہ کس حال میں ہوگا، شیراز کے انسو بہنے لگے۔ روی نے شیراز کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔ لیکن تھانیدار کے سخت دل پر کچھ اثر نہ پڑا۔

''دیکھو بھائی، اج تو میرے پاس کوئی اسٹاف ہے نہیں، منتری جی کا غیر ملکی نسل کا کتا کھو گیا ہے۔ پورا اسٹاف اس کی تلاش میں گیا ہوا ہے۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں اپ، میرے بچے سے زیادہ کتے کی اہمیت ہے؟ ایک دن میں تو میرے بچے کا نہ جانے کیا حشر ہوگا؟''

وہ منتری جی کا کتا ہے، منتری جی کا، سمجھو۔ ہماری روزی روٹی کا سوال ہے۔ ہماری بھی فیملی ہے۔ ''اگر اپ کی فیملی ہے تو اپ کے بچے بھی ہوں گے۔ ذرا سوچئے اگر اپ کا بچہ کھو گیا ہو تو؟'' تھانیدار کے تیور کچھ ڈھیلے پڑے، ''میرے بھائی اگر اس وقت میرا بچہ بھی ہوتا نہ تو میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اوپر سے ارڈر ہے، میں بھی کیا کروں۔ تھانیدار نے بیچارگی سے کہا۔ شیراز اور روی بوجھل قدموں سے تھانے سے نکل کر بھاسکر افس گئے اور شان کے کھونے کی رپورٹ لکھوائی۔ گھر پر سب اس کے دکھ میں شریک ہونے اپنے کام دھندے چھوڑ کر اگئے تھے۔ سب بچے کی تلاش میں لگے تھے، لیکن بچے کا کوئی پتہ نہ تھا۔ دن گزر گیا کالی سیاہ رات اگئی۔ رات ہوتے ہی شہلا اور شیراز اور بے چین ہو گئے رات کو ہر زخم اور تازہ ہو جاتا ہے۔ ''نہ جانے پھول سا بچہ کس حال میں ہوگا، میرا شان'' شہلا کی سسکیاں رات کے سناٹے کو چیرتیں۔ شیراز کو بھی کسی پل قرار نہ تھا۔ انکھوں میں کبھی نٹھاری کیس گھوم جاتا تو جھرجھری اجاتی۔ اس کا دوست روی سائے کی طرح اس کے ساتھ تھا۔ اس کو تسلی دیتا۔

صبح ہوئی پھر وہ دونوں گھانے پہنچے۔ تھانیدار کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھی۔ چہرے سے تھکان برس رہی تھی۔ ''ہاں جی کہو، کوئی پھروتی کا فون وون ایا''

تھانیدار روٹین مشین کی طرح سوالات کرنیلگا۔ ''نہیں کوئی فون نہیں ایا۔''

صاحب ہم مڈل کلاس ہیں۔ بڑی مشکل سے اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھتے ہیں۔ ہم سے کون پھروتی مانگے گا۔'' تھانیدار نے منھ بچکایا۔

''تھانیدار صاحب میرے بچے کو تلاش کر دیجئے بڑی مہربانی ہوگی۔ بھوکا پیاسا غمزدہ باپ گڑگڑانے لگا۔ ''کوشش کریں گے منتری جی کا کتا مل جائے پہلے تو جان میں جان ائے''۔ روی اور شیراز پھر منہ

لٹکائے وہاں سے اگئے۔فون کھٹکھٹاتے رہے لیکن شان کا کوئی سراغ نہیں لگا۔''روی میں نے کبھی کسی کے ساتھ برا نہیں کیا۔ میرے ساتھ کون اتنا بڑا ظلم کرے گا۔ روی کا بھی سر چکرا رہا تھا۔ یہ گتھی سلجھ نہیں رہی تھی ادھر منتری جی کے کتے کا کوئی سراغ نہیں لگ رہا تھا۔شام کے سائے پھر گھرنے لگے۔ سب لاچار اور بے بس اداس بیٹھے تھے کہ دروازے پر ایک ٹیکسی اکر رکی۔اس میں سے ایک دیہاتی (گاؤں کا) ادمی اور شان اترے۔''میرا بچہ، میرا بچہ'' روی نے بجلی کی تیزی سے چھلانگ لگائی اور بچے کو لپٹا۔ پھول سا چہرہ کمہلا گیا تھا۔شہلا بھی بدحواس بھاگی اور شان کو کلیجے سے لگا کر رونے لگی۔کبھی شان کا پھول سا چہرہ چومتی تو کبھی سینے میں بھینچ لیتی۔ اتنے میں روی شیراز نے انے والے ادمی کی طرف دھیان دیا۔''بیٹھو بھیا، اپ کو یہ بچہ کہاں سے ملا'' شیراز نے بیتابی سے پوچھا۔

میرا مکان شہر کے باہر ہے میں وہاں سے شہر کی فروٹ منڈی میں پھل بیچنے اتا ہوں۔کل جب میں دوپہر منڈی ختم ہونے کے بعد جارہا تھا تو مجھے سنسان سڑک کیکنارے یہ بچہ روتے ہوئے ملا، پاس میں ایک لمبے بالوں والا ادمی پیشاب کررہا تھا۔ مجھے کچھ دال میں کالا لگا۔ میں نے اپنی ٹرولی روکی اور بچے کے پاس جا کر اس کا نام پوچھنے لگا۔اتنے میں جلدی سے وہ لمبے بالوں والا ادمی اگیا۔ اے بچے کو ہاتھ نہ لگانا، یہ میرا بچہ ہے۔اس نے اپنی سرخ انکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ یہ تانترک مجھے دیکھا ہوا لگا۔ میں کانپ گیا۔ میں نے اس کو دھکا دے کر گرادیا اور راستے چلتے کچھ لوگوں کو اواز دی سب نے اس کی دھنائی کردی۔ میں بچے کو گھر لے ایا۔اور وہ لوگ اسے پولیس کے پاس لے گئے۔ میں اور میری بیوی نے بہت بہلانے کی کوشش کی لیکن بچہ ڈرا ہوا تھا، ماں باپ کو یاد کر کے روتا رہا۔ اخر تک کر سو گیا۔

صبح جب میں منڈی پہنچا، وہاں کام ختم ہونے کے بعد میں نے اخبار دیکھا تو اس بچے کی تصویر دیکھی، تو فوراً گھر جا کر اپ کی امانت اپ کے پاس لے ایا۔

میرے بھائی میں تمہارا احسان کس منھ سے ادا کروں، تم نے ہمیں نئی زندگی دی، ورنہ ہماری زندگی موت سے بدتر تھی۔شیراز اور شہلا رونے لگے۔

اچھا بھائی ایک بات بتاؤ، تم نے کہا، اس ادمی کی صورت دیکھ کر میں کانپ گیا، ایسا کیوں؟ روی نے پوچھا۔

''صاحب ہماری شادی کو دس سال ہو گئے لیکن ہمارے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ہر در پر ماتھا ٹیکا، سجدہ کیا، کسی نے ایک یوگی تانترک کے بارے میں بتایا، میں اور میری بیوی وہاں گئے تو اس بابا نے کہا

''تمہارے اولاد ہوسکتی ہے لیکن اس کے لیے تمہیں کسی بچے کی بلی دینی ہوگی۔ یہ سن کر میں اگ بگولا ہوگیا۔ اور یہ کہہ کر چلا آیا کہ اپنیگھر کو روشن کرنے کے لیے میں کسی گھر کا چراغ نہیں بجھا سکتا۔ مالک کی جو مرضی۔ میں اور میری بیوی اس ڈھونگی بابا کو بہت دنوں تک گالیاں دیتے رہے۔ نہ جانے اس نے اپنے کاموں کے لیے کتنے بچوں کو قربان کیا ہوگا۔ یہ وہی بابا تھا اس لیے میں کانپ گیا۔

شہلا اور شیراز تھرا گئے، لرز گئے۔ شہلا نے کس کر اپنے بچے کو بھینچ لیا۔ شیراز نے بڑھ کر اس اجنبی ہمدرد کے پیر پکڑ لئے۔ میرے پاس تمہارے لیے شکریہ کے الفاظ نہیں۔ صاحب اپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ بس اتنا احسان کریں کہ کبھی کبھی ہمیں اس بچے سے ملنے دیا کریں۔ میری بیوی تو اس سے ایک دن میں ہی بہت پیار کرنے لگی ہے۔''

''ہاں میرے بھائی تم جب چاہو آیا جاؤ۔ اس گھر کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔''

دوسرے دن کے اخبار میں منتری جی کے کتے کے ملنے کی خبر تھی۔

☆☆☆

Logon ka kaam hai kahna by Humaira Sayeed(Asst. Prof. Urdu
NTR Degree College(Womens) Mahboob Nagar cell-9346377993
حمیرہ سعید (اسسٹنٹ پروفیسر اُردو این ٹی آر ڈگری کالج (اُناث) محبوب نگر

لوگوں کا کام ہے کہنا

ایک ہفتے میں پانچ دعوتوں کا مزہ لوٹنے کے بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ آخر ہم بھی خاندانی ہیں، شریف ہیں لہٰذا صرف دعوت کھانا ہی ہمیں زیب نہیں دیتا بلکہ ہمیں دعوت دینی بھی چاہیے۔ بس اس خیال کا آنا ہی تھا کہ ہم نے دعوت کرنے کی ٹھان لی۔ اس بارے میں سب سے پہلے تبادلۂ خیال ہوا اپنے شوہر نامدار سے۔ پوچھا کس چیز کی دعوت کرنا چاہ رہی ہو؟ ہم حیران ہوئے دعوت کھانے اور کاہے کی۔ پتہ نہیں یہ شوہر حضرات کبھی کبھی اتنا انجان بننے کی اداکاری کیوں کرتے ہیں۔ جب کہ جانتے ہیں کہ جان نہیں چھوٹنے والی۔ انھوں نے کہاں کھانے کی دعوت لیکن کس خوشی میں؟ دعوت کے لیے کوئی خوشگوار موقعہ تو ہونا چاہیے۔ ہم نے کہا موقعہ تو نکال لیں گے بات کاٹ کر فوراً بولے۔ دعوت کروگے تو پورا اہتمام کرنا ہوگا۔ ہال کا انتظام، کھانے میں لوازمات کا خیال۔ ہم نے کہا آپ پریشان مت ہوں ہم صرف ایک ڈش بریانی بنالیں گے اور گھر پر ہی انتظام کرلیا جائے گا۔ تو بولے بیگم اتنی سادہ دعوتیں کھانے کے لیے لوگ ٹرافک کی صعوبتیں برداشت کرکے کیوں آئیں گے۔ ان کو ہونے والے پٹرول خرچ میں وہیں بریانی کا پارسل مل جائے گا اور کوئی تمہاری دعوت قبول بھی نہ کرے گا۔ اسی لیے اگر دعوت کرنی ہو تو مہمانوں کے شایانِ شان ہونی چاہیے۔ اس تکرار کے بعد ہم نے سوچا چلو لوگوں سے پوچھ کر دیکھتے ہیں۔ ایک سروے کرلیتے ہیں کہ آیا ہمارے شوہر کا کہنا درست ہے یا نہیں۔ واقعی لوگ دعوتوں کے لیے خلوص دل نہیں بلکہ جلوس ڈش دیکھ کر حامی بھرتے ہیں۔

تحقیق کے کچھ جراثیم ابھی بھی شاید زندہ تھے سوچا پڑوسی کا حق سب سے پہلے ہوتا ہے تو سب سے پہلے پڑوسی سے ہی پوچھا۔ آج کل کی دعوتوں اور شادیوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ بولے آج کے لوگ سلیقہ مند ہوگئے ہیں بہت ہی اہتمام سے شادی کر رہے ہیں۔ ہم نے کہا شادی کے لیے اہتمام کی کیا ضرورت ہے؟ لڑکا لڑکی اور قاضی ہوگئی شادی۔ بولے یہ تو کورٹ میاریج ہوگی۔ جب تک دلہا دلہن کے ہاتھ پیلے نہ ہوں، دھوم دھڑاکا نہ ہو، رسم ورواج ادا نہ کیا جائیں شادی

ہی نہیں کہلائے گی۔ ہم نے کہا اسلام کی تعلیمات اور طبی سائنس کی تنبیہات میں یہ لکھا ہے کہ رات 9 بجے سے قبل ہی سو جانا چاہیے تا کہ صحت اور شرافت دونوں برقرار رہے۔ لیکن آج کل تو رات 9 بجے کے بعد ہی شادیاں شروع ہو رہی ہیں۔ کہا کہ زمانے کے حساب سے چلنا پڑتا ہے۔ اب ہمارے سمجھ میں نہیں آیا کہ اپنا پیسہ اور صحت لٹا کر زمانے کو خوش کر کے آپ کو کونسی جنت مل رہی ہے۔ جگر مرادآبادی نے کہا تھا:

ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں ہم سے زمانہ خود ہے زمانے سے ہم نہیں

گستاخی معاف! پتہ نہیں جگر اس شعر کو لکھتے وقت یا تو نشے میں تھے یا ان کے ہوش ٹھکانے نہیں تھے۔ ورنہ اتنی بڑی غفلت کیسے کرتے۔ کہتے ہیں ہم سے زمانہ خود ہے زمانے سے ہم نہیں۔ جب سے ہوش سنبھالا گھر والوں سے، باہر والوں سے، پڑھے لکھوں سے، جاہلوں سے، امیروں سے، غریبوں سے، نیتاؤں سے اور یہاں تک کہ فقیروں سے بھی یہی سنا ہے کہ ''زمانے کے حساب سے چلنا پڑتا''۔ رُکیے رُکیے صرف یہ ایک ہی نہیں بلکہ ایسے بیسوں جملے نہ صرف ہمارے کانوں میں گونجتے رہے بلکہ آپ سنیں گے تو یہ آپ کو بھی مانوس نظر آئیں گے۔ دنیا کا دستور ہے کرنا پڑتا، لوگ کیا کہیں گے کرنا پڑے گا، لوگاں کیا بولیں گے، زمانے سے نرالے تو نہیں ہیں، لوگ کیا سوچیں گے، ایسے اور بھی کئی جملے جب سماج میں فرد واحد کی اہمیت ہی نہیں سمجھی جاتی تو پتہ نہیں ارسطو کے دماغ میں یہ کیڑہ کیوں کُلبلایا کہ فرد سے سماج ہے۔ جب کہ حقائق اس سے پرے ہیں۔ فرد تو اپنی انفرادی اہمیت اور اپنی شخصیت کو تسلیم کر ہی نہیں پا رہا ہے۔ کوئی بھی کام کوئی بھی مقصد لے لیں تان جا کر ٹوٹتی ہے ''لوگوں'' پر۔ ''لوگوں'' بھی دراصل سماج کا ''Logo'' بن کر رہ گیا ہے۔ دوسرے کاموں اور طریقوں کو چھوڑ کر ہم صرف شادی کے موضوع کی بات کر رہے ہیں۔ شادی کی دعوت، رسم شادی، دراصل فرد کے لیے شادمانی نہیں بلکہ پریشانی بن کر رہ گئی ہے۔ ہم سماج اور لوگوں کے نام پر شادی بیاہ میں وہ ساری رسموں اور طور طریقے اپنا رہے ہیں جو کہ قطعی غیر ضروری اور غیر منطقی ہیں۔ اشرف المخلوقات جو ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے ہیں شادی کے اخراجات کے معاملے میں پتہ نہیں لوگوں کے سامنے اتنے بے بس کیوں ہو جاتے ہیں۔

ہم نے ایک بزرگ سے پوچھا آج کل شادی میں کتنا اسراف ہو رہا ہے۔ بولے کے یہ نکاح کی رسم ''قبول ہے'' کہ علاوہ باقی سب فضول ہے یعنی باقی سب اسراف ہے۔ غور کیا تو بات سولہ آنے سچ لگی۔ نکاح کے آسان اور سادہ طریقے کو لوگوں نے کتنا پیچیدہ بنا لیا ہے۔ ایک بات ہم کو سمجھ

میں نہیں آتی بڑا سے بڑا مجرم پکڑا جاتا ہے لیکن سب کی زندگی اجیرن کرنے والے یہ ''لوگ'' کیوں نہیں پکڑے جاتے۔ایک بار جان پہچان والوں میں شادی کی تیاریاں چل رہی تھیں۔منصوبے بنائے جارہے تھے کہ کس طرح سے انتظامات کیے جائیں۔دلہن کی ماں نے کہا دس تولے سونا تو دینا ہی پڑے گا۔ہم نے کہا کیوں؟ بولیں اس سے اگر کم دیں تو لوگ کیا کہیں گے۔پھر بڑی کو بھی دس ہی دیا تھا۔دلہن نے کہا میں تو پیا کیچ لے کر پارلر سے تیار ہوکر آؤ گی ورنہ سہیلیاں مذاق اڑائیں گی۔دلہن کے والد نے کہا زمانے کے حساب سے سامان دینا ہوگا ورنہ لڑکی کو تانے سننے کو ملیں گے۔بھائی نے کہا کھانا معیاری ہونا چاہیے ورنہ لوگوں میں ناک کٹ جائے گی اور جب بجٹ بنایا گیا 10 تا 12 لاکھ۔ ہم کو بہت حیرت ہوئی۔اگر یہ سب لوگ اپنی ذاتی خوشی کے لیے اتنا پیسہ خرچ بھی کر لیتے تو شاید کوئی حرج نہ تھا لیکن وہ اس لیے خرچ کرنا چاہ رہے تھے تاکہ زمانہ، سہلیاں اور لوگ خوش ہوجائیں۔یہی ایک بات ہمیں کبھی سمجھ نہیں آئی۔اپنوں کی خوشی مقدم ہے یا لوگوں کی..... غور کیجیے گا۔ویسے یہ لوگ ہمیں مل جائیں نا تو ان کی ایسی خبر لیں گے ارے ہم ہی کیوں آپ کو بھی نظر آئیں تو چھوڑیئے گا نہیں۔ فرد کی انفرادی خوشیوں کو آگ لگانے کے جرم میں سزا دلوایں گے۔اب آپ ہی بولیے جگرؔ صاحب کیسے کہہ گئے زمانے سے ہم نہیں جب کہ دن بھر ہم لوگوں کے لیے ہی اٹھتے بیٹھتے ہیں اور تو اور ان نام نہاد لوگوں کے لیے اتنا کرنے کے باوجود کیا وہ لوگ خوش ہو پائیں گے؟ نہیں بالکل نہیں۔آپ نے لاکھوں روپیہ بڑا شادی خانہ لے کر خرچ کیا اپنے اسٹیٹس کے لیے، گرمی کی شکایت کریں گے، شاندار کھانے کا انتظام کیا چاول کی نرمی کی شکایت ہوگی۔دیگ شاندار دیا، انتظامات کا نسخ نکالیں گے۔غرض آپ چاہے جتنا بھی خون پسینہ ایک کرلیں اچھے سے اچھا انتظام کرلیں خود کو قرضوں کے بوجھ تلے دبالیں یہ لوگ مطمئن ہونے والے نہیں ہیں جتنے منہ اتنی باتیں۔اسی لیے ہمیں لگتا ہے کہ اگر شادی میں اسراف پر روگ لگانا ہے تو تقریریں کرنے کے بجائے مودی جی کی پالیسی اختیار کرنی ہوگی۔نوٹ بندی کی طرح لوگوں کی ہونٹ بندی ہونی چاہیے پھر خود بہ خود ہی اصراف بند ہوجائے گا۔

☆☆☆

Anjuman Nusrat-ul-Asheqaan (Inshayiya|) by Kachu Isfandyar Khan
Srinagar, cell-6005889842, 9419000933 کاچو اسفندیار خاں (سرینگر)

نجمن نصرت العاشقاں (انشائیہ)

دور حاضر کے اس سیماب صفت سماجی اور معاشی نظام میں لوگوں میں یک جہتی اور مل جُل کر کام کرنے کا جذبہ کچھ اسقدر زیادہ پیدا ہو گیا ہے کہ زندگی کے جس شعبہ پر بھی نظر ڈالیں وہاں ہم پیشہ و ہم نوالہ افراد مل کر انجمنیں قائم کر رہے ہیں اور سوسائٹیوں کی داغ بیل ڈال رہے ہیں۔ تا کہ وہ اپنی ہر جائیز اور نا جائیز مانگوں اور حقوق کو منوانے کی خاطر زیادہ سے زیادہ افرادی قوت اور یک جہتی کا مظاہرہ کر سکیں۔ شروع شروع میں مزدوروں کی انجمنیں بننے لگیں۔ کیونکہ صنعتی انقلاب کے بعد سماج میں وہی طبقہ تھا جو برسوں تک لوٹ کھسوٹ اور استحصال کا شکار رہا۔ اُن کی کسمپرسی اور بے چارگی کی دل دھلا دینے والی پکار جب خالق کائنات نے سنی۔ تو اس چرخ نیلوفری کے ایک ہی چکر میں مارکس اور ہیگل جیسے فلاسفر پیدا کئے۔ جنہوں نے اس طبقہ کی حالت زار پر صفحوں کے صفحے لکھ ڈالے۔ ان میں اتحاد اور یک جہتی پیدا کرنے پر زور دیا۔ پھر لینن اور ماؤزے تُنگ جیسے عوامی لیڈروں نے ان فلاسفروں کی تحریروں کو بڑے شد و مد سے عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ اس طرح کچھ ہی عرصہ میں دنیا کے نصف حصے پر پرولتاری حکومت قائم کی گئی۔ مارکس نے اشتراکی دستور کے پہلے صفحے پر لکھا تھا کہ ''دھرتی ماتا کے سینے پر کام کرنے والے مزدورو! ایک ہو جاؤ کیونکہ تمہیں کچھ نہیں کھونا ہے سوائے زنجیروں کے'' اور مارکس کی یہ بات خطرناک حد تک سچ نکلی۔ مزدوروں نے کچھ نہیں کھویا سوائے زنجیروں کے۔

جب دنیا والوں نے یہ دیکھا کہ اتحاد اور اتفاق میں اتنی بڑی قوت ہے تو ہر کس و ناکس اور زندگی کے ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والوں نے جگہ جگہ انجمنیں بنائیں۔ مشت نمونہ از خروار کے مصداق اس انبوہ کثیر انجمنوں میں سے چند کا نام لے کر آگے بڑھتا ہوں تا کہ میرے قارئین کی بے جا سمع خراشی نہ ہو سکے۔ مثال کے طور پر انجمن دوکانداران، انجمن دھوبیان، انجمن نائیان، انجمن ٹانگہ بانان، انجمن ادب نوازان، انجمن درزیان، انجمن میوہ فروشان، انجمن روٹی فروشان، انجمن جوتا

فروشان اور یہاں تک کہ انجمن عصمت فروشان بھی قائم کی گئی ہے۔اب سماج میں ایک ہی طبقہ ایسا رہتا ہے جس میں نہ کوئی اتحاد ہے نہ اس کی کوئی انجمن ہے۔اور اس طبقہ کا ہر فرد سوائے معدود چند کے ابتدائے آفرینش سے ہی گھاٹے میں رہا ہے۔اگر چہ اس طبقے کے بہی خواہوں نے یہ بات شدت سے محسوس کی تھی کہ ان کی بھی کوئی انجمن ضرور ہونی چاہئے لیکن ایک دوسرے کے ساتھ آپسی رقابت اور چپقلش کی وجہ سے یہ انجمن کبھی بھی مورد وجود میں نہیں آسکی۔میرے دوستو! یہ نامراد طبقہ ہے عاشقوں کا۔اب تو آپ بھی میری اس بات کی تائید کریں گے کہ ان کی کوئی انجمن نہیں ہے اور یہ طبقہ ہمیشہ گھاٹے میں رہا ہے جس کی حالت زار کی تصویر کشی ایک ناپختہ شاعر نے اس طرح کی ہے۔ ؎

تھکے تھکے سے قدم زرد زرد سا چہرہ
چاند نکلا بھی مگر ایک عاشق کی طرح

لیکن میرے عاشق بھائیو! نا امید نہ ہوجائیں کیونکہ نا امیدی کفر ہے۔میرے منہ میں گھی شکر ڈالو تو بولوں۔کہ ناچیز نے کل ہی ایک معتبر اخبار میں یہ خبر پڑھی ہے کہ پونا میں عاشقوں کی ایک انجمن وجود میں لائی گئی ہے اور اس کا نام ''انجمن نصرت اللعاشقان'' رکھا گیا ہے۔اس انجمن کے دستور ساز کمیٹی کے ممبران ملک کے کئی مشہور اور نامی گرامی عاشقان ہیں۔ایک اخباری نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے اس کمیٹی کے چیرمین نے کہا ہے ''میرا خیال ہے کہ ہماری یہ انجمن میرے برادر عاشقوں کے لئے فال نیک ثابت ہوگی۔ہم کوشش کر رہے ہیں کہ یہ انجمن رفتہ رفتہ بین الاقوامی سطح پر کام کر سکے گی۔اس کا صدر دفتر بعد میں پونا سے پیرس منتقل کیا جائے گا''۔

عاشقوں کا باوا آدم حضرت مجنون علیہ رحمتہ نے صدیوں پہلے فرمایا تھا،''اے حسن کے پرستارو! ایک ہوجاؤ کیونکہ تمہیں کچھ نہیں کھونا ہے سوائے جوتوں کے''۔لیکن عاشقوں کے اس طبقہ میں اتفاق اور اتحاد کبھی پیدا نہ ہوسکا۔در حبیب سے لے کر در رقیب تک یہ طبقہ ہر لمحہ احساس بدگمانی اور حسد کا شکار رہا۔لیکن صدیوں کی جوتا نوشی اور سر پھٹول کے بعد اس طبقہ سے تعلق رکھنے والوں کی بُدھی میں اب یہ بات گھس گئی ہے کہ اب فیر اینڈ لاؤلی، جین اور سینڈل کے دور کی حسیناؤں کے زمانے میں اتحاد اور اتفاق کے بغیر ان کا جینا دوبھر ہوجائے گا۔اور اس طرح صدیوں کے بعد حضرت مجنون کا خواب اب شرمندۂ تعبیر ہوا ہے۔

اس انجمن کے دستور ساز کمیٹی نے اور باتوں کے علاوہ کچھ ضروری اور مفید قسم کی تجاویز بھی پاس کی ہیں جن کا تعلق عاشقوں کی فلاح و بہبودی سے ہے۔مثلاً

(۱) ہڑتالوں اور جلسے جلوسوں کے ذریعہ حکومت پر زور دیا جائے کہ وہ ایسے قانون پاس کر کے جوتا بنانے والی کمپنیوں پر لازم کریں کہ زنانہ جوتے کم سے کم نوک دار بنائے جائیں۔لمبی ایڑ ی والے جوتوں میں خالص چمڑا استعمال نہ کریں بلکہ ان ایڑیوں میں نرم سے نرم کارک استعمال کریں۔تا کہ کسی نامراد عاشق کو اگر جوتا کھانے کی نوبت آ بھی جائے تو اُس کے سرِ مبارک کا استخوان شکستوں سے چور نہ ہو جائے۔تمام دوشیزاؤں خصوصاً کالج جانے والی لڑکیوں کے لئے نرم سے نرم تر ربڑ کے جوتے بنائے جائیں۔

(۲) ایک چارٹی فنڈ بھی قائم کیا جائے جو ضربت حُسن سے مضروب شدہ عاشقوں کے علاج معالجہ کا بوجھ اُٹھا سکے۔تا کہ وہ کسی آوارہ کتے کی طرح کسی سڑک کے کنارے اپنے زخموں کو چاٹتے ہوئے نہ رہ جائے۔

(۳) حکومت پر زور دیا جائے کہ وہ ایک ایسا ہسپتال تعمیر کریں جو صرف عاشقوں کے لئے مخصوص ہوں۔جس کے ہر در و دیوار پر بازار حُسن کی نامور اور چیدہ چیدہ نازنینوں کی تصاویر آویزاں ہوں۔

(۴) ایک ایسی لائبریری قائم کی جائے جس میں آدم اول سے لے کر دور حاضر تک کے سربرآوردہ عاشقوں کی سوانح عمری موجود ہو۔اُن کی پسند ناپسند اور اُن کی مشکلات پر جلدیں موجود ہوں۔وہ تمام خطوط بھی رکھے جائیں جو مشہور عاشقوں نے لکھے ہیں۔

(۵) ایک میوزیم بھی قائم کیا جائے۔جس میں مشہور زمانہ عاشقوں کی یادگاریں رکھی جائیں۔وہ سارے پتھر بھی جمع کئے جائیں جس نے کسی دست نازک سے جست لگا کر کسی نامراد عاشق کا آشفتہ سر چوما ہے۔وہ تمام جوتے بھی اکھٹے کئے جائیں جو بارش رحمت کے روپ میں عاشقوں کے سروں پر برسے ہیں۔

(۶) اگر بازار حُسن میں گرانی آ جائے تو سماج کے باقی طبقوں کی طرح حسب دستور ہڑتال کی کال دی جائے اور اس ہڑتال کو آپریشن وِیل جام کا نام دیا جائے۔ساتھ ہی فلک شگاف نعروں سے آسمان کے اس نیلے گنبد کے نیچے ایک غلغلہ ہائے شور وشین پیدا کیا جائے۔تا کہ عاشقوں کی مکمل ہڑتال سے

بازار حسن کے مہ جمالوں کو اپنی اوقات کا پتہ چل جائے۔

عاشقوں کے طبقہ کو سماج کے باقی طبقات سے الگ اور نمایاں رکھنے کے لئے کمیٹی نے اُن

کیلئے مندرج ذیل چند مخصوص نشانیاں اور وضع تجویز کی ہیں۔

۱۔ تمام عاشق اپنے سر کے بالوں کو معمول سے زیادہ لمبا رکھیں گے۔

۲۔ ہر عاشق پر لازم ہوگا کہ وہ چار دن کا شیور رکھے۔

۳۔ سب عاشق اپنے گلے میں سونے یا چاندی کی زنجیر پہنیں گے جو کہ زنجیرِ عشق کی سمبل ہوگی۔ اُن کے لباس ڈھیلے ڈھالے ہوں گے۔ البتہ خاص خاص موقوں پر لباسِ فرنگی بھی زیبِ تن کر سکتے ہیں۔

تو میرے عاشق بھائیو! اب آپ کی قسمت جاگ اُٹھی ہے۔ خدا کے گھر میں دیر ہے لیکن اندھیر نہیں والا مقولہ آخر کار سچ نکلا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ آپ لوگ پھلیں اور پھولیں اور اپنی یک جہتی، اتحاد اور افرادی قوت کے بل بوتے پر بازارِ حُسن کی سرپھری حسیناؤں کو رُلانے، تڑپانے اور اُن سے بدلہ لینے میں سُرخ رو ہو جائیں۔ آمین۔

☆☆☆

"Blochchain Technology in Education : What, Why and How ?" by
Prof. Noushad Husain (Principal MANUU college of teacher
Education, Bhopal) cell-706359414, 8159973500
پروفیسر نوشاد حسین (پرنسپل مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، بھوپال)

تعلیم میں بلاکچین ٹیکنالوجی: کیا، کیوں اور کیسے؟

بلاک چین ایک نئی ٹیکنالوجی ہے جو مسلسل ترقی کر رہی ہے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں استعمال ہو رہی ہے۔ اس کا آغاز مشہور ڈیجیٹل کرنسی بٹ کوائن' سے ہوا ہے۔ پہلے اسے صرف مالیاتی لین دین کے لیے استعمال کیا جاتا تھا لیکن اب اسے زندگی کے ہر اس شعبے میں استعمال یا تجویز کیا جا رہا ہے جس کے لئے ناقابل تغیر اور محفوظ ریکارڈ رکھنے یا لیجر کی ضرورت ہے۔ بلاک چین بلاکس کی ایک زنجیر ہے جس میں معلومات ہوتی ہیں۔ بلاک کے اندر ذخیرہ شدہ ڈیٹا بلاکچین کی قسم پر منحصر ہوتا ہے۔ بلاک چین کرپٹوگرافک ہیش فنکشنز (cryptographi hash functions) کا استعمال کرتے ہوئے تخلیق کردہ بلاکس کا مجموعہ ہوتی ہے اور کرپٹوگرافک الگورتھم (cryptographic algorithms) کا استعمال کرتے ہوئے ایک محفوظ چین کی شکل میں پچھلے بلاک کے ساتھ جڑی ہوئی ہوتی ہے۔

بلاک چین کے اقسام: پرائیویٹ اور پبلک بلیک چین بلاک چینز کے دو اہم انداز ہیں۔ تاہم کئی قسمیں ہیں، جیسے کنسورشیم اور ہائبرڈ بلاک چینز۔

ا۔عوامی پبلک بلاک چین: اس قسم کی بلاک چینز میں لیجرز (ledgers) انٹرنیٹ پر ہر کسی کو نظر آتے ہیں۔ یہ کسی کو بھی بلاک چین میں ٹرانزیکشنز (transactions) کے بلاک کی تصدیق اور شامل کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ عوامی نیٹ ورکس میں لوگوں کے شامل ہونے اور اسے مفت میں استعمال کے لیے مراعات ہوتے ہیں۔ کوئی بھی عوامی بلاکچین نیٹ ورک استعمال کر سکتا ہے۔ ایک عوامی بلاکچین نوڈ یا صارف موجودہ اور تاریخی ریکارڈز تلاش کر سکتا ہے، منتقلی اور کام کے ثبوت آنے والے بلاکس کی تصدیق اور مائین (mine) کر سکتا ہے۔ کرپٹو کرنسی کی مائینگ (mining) اور

تجارت مشترکہ بلاک چینز کے سب سے عام استعمال ہیں۔ نتیجے کے طور پر سب سے زیادہ استعمال ہونے والی لامرکزی بلاک چینز (decentralised block chains) بٹ کوائن (Bitcoin) اور لائٹ کوائن (Lite coin) ہیں۔ اگر صارف حفاظتی رہنما خطوط اور طریقہ کار کو لاگو کرتے ہیں تو عوامی بلاک چینز بڑی حد تک محفوظ ہیں۔

۲۔ زاتی (پرائیویٹ) بلاکچین: زاتی بلاکچین ایک ہی تنظیم کے اندر ہوتی ہیں۔ یہ تنظیم کے مخصوص لوگوں کو ہی بلاکس کی تصدیق اور ٹرانزیکشن شامل کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ تاہم انٹرنیٹ پر ہر کسی کو عام طور پر اسے دیکھنے کی اجازت ہوتی ہے۔ پرائیویٹ بلاک چینز عملی طور پر پبلک بلاک چینز سے ملتی جلتی ہیں لیکن ان کا نیٹ ورک چھوٹا اور زیادہ محدود ہوتا ہے۔ پرائیویٹ بلاکچین کا اطلاق عام طور پر ووٹنگ، سپلائی چین، ڈیجیٹل شناخت، دولت کے انتظام اور دیگر ایپلی کیشنز میں ہوتا ہے۔

۳۔ شرکتی یا وفاقی (فیڈریٹڈ یا کنسورشیم) بلاکچین: اس بلاکچین ویرینٹ میں صرف تنظیموں کا ایک گروپ ہی لین دین کی تصدیق اور اضافہ کرسکتا ہے۔ یہاں لیجر کھلا یا منتخب گروپوں تک محدود ہوسکتا ہے۔ کنسورشیم بلاکچین کو مختلف آرگنائزیشن کے درمیان استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ صرف پہلے سے اجازتشدہ نوڈس کے ذریعے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ سرکاری محکمے، مالیاتی ادارے اور دیگر ادارے بھی کنسورشیم بلاک چین استعمال کرتے ہیں۔

۴۔ مخلوطہا ئبرڈ بلاکچین: ایک ہائبرڈ بلاکچین ملکیتی اور عوامی بلاک چین دونوں کے فوائد کو یکجا کرتی ہے۔ اس میں بلاک چین کی تمام اقسام کی خصوصیات شامل ہیں۔

بلاکچین کی خصوصیات: بلاک چین ٹیکنالوجی نہ صرف کرپٹو کرنسیوں (crypto currencies) کے لیے استعمال کی جاتی ہے بلکہ اسے مختلف متنوع ایپلی کیشنز میں استعمال کیا جا رہا ہے اور مندرجہ ذیل خصوصیات کی وجہ سے بہت سی مزید چیزوں میں تجویز کیا جا رہا ہے۔

۱۔ تغیر پزیری: بلاکچین کی سب سے اہم خصوصیات میں سے ایک نا قابل تبدیلی ہے جو اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ ٹیکنالوجی جہاں ہے وہیں موجود ہے یعنی کہ مستحم اور نا قبل تبدیلی نیٹورک۔

۲۔ لامرکزی: نیٹ ورک لامرکزی ہے جس کا مطلب ہے کہ اس نظام کو کوئی ایک ادارہ یا فرد کنٹرول نہیں کرتا ہے۔

۳۔ بہترین تحفظ: چونکہ اس میں کوئی ایک مرکزی اتھارٹی کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کوئی بھی اپنے فائدے کے لیے نیٹ ورک کی خصوصیات کو آسانی سے ایڈجسٹ نہیں کرسکتا۔ خفیہ کاری آلہ میں تحفظ

کی ایک اور پرت کا اضافہ کرتی ہے۔

۴۔ **تقسیم شدہ لیجر:** عوامی لیجر میں عام طور پر کسی لین دین اور اس کے شرکاء کے بارے میں تفصیلات ہوتی ہیں۔ یہاں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں ہے کیونکہ یہ صرف کھلے میں ہے۔ دوسری طرف پرائیویٹ یا فیڈریٹڈ بلاکچین کی دلیل تھوڑی مختلف ہے۔ تاہم ایسے حالات میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد دیکھے گی کہ لیجر میں اصل میں کیا ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈیوائس پر موجود تمام صارفین نیٹ ورک پر لیجر کو برقرار رکھتے ہیں۔ بہتر نتیجہ حاصل کرنے کے لیے مشینوں کے ذریعے کمپیوٹنگ کی طاقت پھیلائی گئی۔

۵۔ **اتفاق رائے:** اتفاق رائے نیٹ ورک کے فیصلہ سازی کے طریقہ کار پر حصہ لینے والے نوڈس کی کمیونٹی ہے۔ اس معاملے میں نوڈس آسانی سے اور معقول حد تک قبول کر لیں گے۔

۶۔ **تیز تر تصفیہ:** روایتی بینکنگ اسکیموں کے برعکس بلاکچین ایک تیز سیٹلمنٹ کی اجازت دیتی ہے۔ یہ ایک شخص کو زیادہ تیزی سے فنڈز پاس کرنے کے قابل بنائے گی جس سے طویل مدت میں وقت کی بچت ہوتی ہے۔

بلاکچین ایپلی کیشنز اور استعمال کے کیسز: بلاکچین کو مختلف ایپلی کیشنز اور استعمال کے معاملات میں استعمال کرنے کی تجویز دی گئی ہے جیسا کہ ذیل میں دیا گیا ہے۔

۱۔ **مالیاتی ایپلی کیشنز:** بلاک چین ٹیکنالوجی اس وقت کاروباری خدمات، مالیاتی اثاثوں کی تصفیہ، پریڈکشن مارکیٹ (prediction markets)، اقتصادی لین دین کے ساتھ مختلف مالیاتی شعبوں میں استعمال کی جا رہی ہے۔ مارکیٹ پلیس سسٹم (Marketplace systems)، جو اوریکلز یا انٹیلی جنس ذرائع کے طور پر کام کرتے ہیں، ایک اور دلچسپ علاقہ ہے جو کمپنیوں اور کرپٹو کرنسیوں کو متاثر کر سکتا ہے۔ بلاک چین مالیاتی معیشت کی طویل مدتی عملداری میں ایک اہم کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہے جو سرمایہ کاروں، موجودہ بینکنگ سسٹم اور مجموعی طور پر معاشرے کو فائدہ پہنچاتا ہے۔

۲۔ **صحت کی دیکھ بھال کا انتظام:** بلاک چین ٹیکنالوجی صحت کی دیکھ بھال فراہم کرنے والوں کے لیے ایک اہم حل فراہم کر سکتی ہے جن میں صحت کی دیکھ بھال کے انتظام، آبادیاتی صحت کی دیکھ بھال کی تاریخ، الیکٹرانک انشورنس کلیمز سیٹلمنٹ اور دور دراز کے مریضوں کے طبی ڈیٹا کا اشتراک شامل ہے۔ یہ صارف پر مبنی طبی معائنہ فراہم کرے گا، جعلی مصنوعات اور ادویات کو روکے گا اور کلینیکل

ٹرائل ڈیٹا کا انتظام کرے گا۔مخصوص طور پر سمارٹ کنٹریکٹس کے ساتھ بلاک چین کلینکل ٹرائل کے نتائج کی سائنسی ساکھ اور مریض کی باخبر رضامندی جیسے مسائل کو حل کرسکتا ہے۔

۳۔ گورننس: حکومتیں رہائشیوں اور کاروباروں کے سرکاری کھاتوں کا انتظام اور دیکھ بھال کرتی ہیں۔منقطع لین دین اور ریکارڈ کیپنگ کے ذریعے بلاک چین سے چلنے والی ایپلی کیشنز مقامی اور ریاستی حکومتوں کے کام کرنے کے طریقے کو بدل سکتی ہیں۔پبلک انفارمیشن کے انتظام کے لیے بلاک چین کی شفافیت، آٹومیشن اور سیکیورٹی ممکنہ طور پر بدعنوانی کو روک سکتی ہے اور حکومتی خدمات کو بہتر بنا سکتی ہے۔بلاک چین کو سمارٹ سٹی فریم ورک(smart city framework) میں جسمانی، سماجی اور صنعتی انفراسٹرکچر کو یکجا کرنے کے لیے ایک محفوظ نیٹ ورکنگ نیٹ ورک کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔بلاک چین گورننس کا مقصد ریاست اور اس سے متعلقہ عوامی اداروں کے وسائل کو ایک ہی قانونی حیثیت برقرار رکھتے ہوئے لامرکزی اور مؤثر طریقے سے فراہم کرنا ہے۔

۴۔ووٹنگ: ای ووٹنگ(E-voting) کو انتخابی عمل کو آسان بنانے، قانون کی پیچیدگیوں کو کم کرنے اور وقت اور مالی اخراجات کو کم کرنے کے لیے ایک امید افزا اور گیم چینجر ٹیکنالوجی کے طور پر تجویز کیا جا رہا ہے۔پھر بھی سیکورٹی کے مسائل اور سائبر سیکورٹی کے خطرات کی وجہ سے اس نے ابھی رفتار حاصل نہیں کی ہے۔بلاکچین ای ووٹنگ کے لیے ایک قابل اعتماد اور محفوظ پلیٹ فارم فراہم کرسکتا ہے جو ملکی قوانین کے مطابق ہوسکتا ہے۔

بلاکچین کے کاروباری اور صنعتی ایپلی کیشنز: بلاک چین کاروباری عمل کو تقویت دینے، بہتر بنانے اور خودکار بنانے کے ذریعے کاروبار اور انتظام میں نیا پن کا ایک اہم ذریعہ بن سکتا ہے۔ IoT اور Blockchain بہت سے جدید ای-بزنس ماڈلز(e-business models) کو جنم دے رہے ہیں۔

۱۔ انٹرنیٹ آف تھنگز (IoT): آبادی میں اضافے کے لیے انٹرنیٹ آف تھنگز (IoT) کے اطلاق کے نتیجے میں ہر روزمرہ کی زندگی کے شعبوں میں اس کا اطلاق ہوا ہے اور یہ ترقی کے لیے اہم بن گیا ہے۔اگرچہ IoT استعمال کرنے کے بہت سے فوائد ہیں لیکن مختلف حفاظتی خطرات بھی ہیں۔ہارڈ ویئر کی محدود صلاحیتوں کی وجہ سے ایسے ماحول میں روایتی کرپٹوگرافک سیکورٹی میکانزم(cryptographic security mechanism) کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ بلاکچین IoT نیٹ ورک کو محفوظ کرنے کے لیے ایک پلیٹ فارم اور طریقہ کار فراہم کرسکتا ہے اور یہ

ایک محفوظ، قابل بھروسہ اور قابل عمل IoT نیٹ ورک کے لیے ایک کھلا IoT نیٹ ورک فراہم کرسکتا ہے۔

۲۔توانائی کا شعبہ: توانائی کی مارکیٹ میں بلاک چین کی ممکنہ ایپلی کیشنز بہت زیادہ ہیں اور ان کا عمل اور نیٹ ورک دونوں پر اہم اثر پڑے گا۔ بلاکچین لاگت کو کم کرسکتا ہے اور نئے کاروباری ماڈلز کو فعال کرسکتا ہے جبکہ مارکیٹ پلیس (marketplaces) اور گرڈ نفاست، ڈیٹا سیکیورٹی اور ملکیت کا انتظام کرنے کے لیے بہترین طریقے سے لیس ہوسکتے ہیں۔ یہ پاور گرڈ کو زیادہ مؤثر طریقے سے کام کرنے اور مطالبہ کے ردعمل کو مؤثر طریقے سے کنٹرول کرنے اور توانائی کے ذرائع میں وسائل کے استعمال کی نگرانی اور بلنگ کے لیے ایک بنیاد فراہم کرسکتا ہے۔

۳۔متفرق ایپلی کیشنز: کراؤڈ فنڈنگ (Crowdfunding) بلاک چین ٹیکنالوجی کے استعمال کا ایک مناسب کیس ہے۔ انسان دوستی اور انسان دوستی کے شعبوں میں بلاک چین کے نفاذ کو بھوک سے نمٹنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بلاک چین ذہین، محفوظ، تقسیم شدہ اور خودمختار نقل وحمل کے نیٹ ورکس اور سمارٹ سٹی سیاق وسباق میں ایونٹ کے ٹکٹوں کا محفوظ طریقے سے انتظام کرسکتا ہے۔ ایج کمپیوٹنگ اور کمپیوٹیشنل ریسورس شیئرنگ نیٹ ورکس کی تخلیق، گرڈ کمپیوٹنگ، کلاؤڈ کمپیوٹنگ اور ڈیوائس کنیکٹر کے طور پر بلاکچین کا استعمال آئی ٹی سے متعلقہ بلاکچین ایپلی کیشنز میں سے کئی ہیں جو خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔

تعلیم میں بلاک چین کے استعمال: بلاک چین تعلیمی اداروں کو اساتذہ کی مدد کرنے، سرپرستوں اور کمیونٹی کے اراکین کو علم کی فراہمی، نئے سیکھنے کے نظام کو بااختیار بنانے اور مزید طلباء کے لیے سیکھنے کے مواقع کو وسعت دینے اور فراہم کرنے کی صلاحیت کو مضبوط کرنے میں مدد کرسکتی ہے۔ تعلیم کے میدان میں بلاک چین ٹیکنالوجی کے استعمال اور فوائد مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔آن لائن تعلیم: آن لائن تعلیم جسے فاصلاتی تعلیم یا برقیاتی اکتساب بھی کہا جاتا ہے معلومات فراہم کرنے اور سیکھنے کی سہولت کے لیے ڈیٹا اور انٹرنیٹ ٹیکنالوجی کا استعمال کرتا ہے۔ اسے ویب پر مبنی سیکھنے کی تکنیک کہا جاتا ہے۔ بلاکچین ایجاد کے ساتھ آن لائن اکتساب کے مسائل کا ایک مثالی حل جیسے کہ قانونی حیثیت اور تحفظ پیش کیا جائے گا۔ بغیر کسی تیسرے فریق کی نگرانی کی ضرورت کہ بلاکچین آن لائن تدریس کے لیے غیر تبدیل شدہ سیکھنے کے دستاویزات بھی بنائے گا تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جاسکے کہ کورس کے کریڈٹ کو مناسب طریقے سے تسلیم کیا گیا ہو۔

۲۔طالب علم کے ریکارڈز: اعلیٰ تعلیم میں طلباہ کی تعلیمی تحریروں کو محفوظ کرنا سب سے زیادہ وقت طلب اور محنت طلب عمل میں سے ایک ہیں۔طالب علم کے درجات کا توثیق شدہ ریکارڈ دستیاب ہونے سے پہلے ہر اندراج کی صداقت کے لیے دستی طور پر جانچ کی جانی چاہیے۔کورس کے مواد کا سرٹیفکیشن طالب علم کے ریکارڈ کی ایک اور قسم ہے جس کی اکثر تلاش کی جاتی ہے۔اس ریکارڈ کو مانگنے والے ہر طالب علم کے لیے ہر صفحے پر دستخط اور مہر لگائی جانی چاہیے (درستگی کو یقینی بنانے کے لیے)۔اگر کورس کے مواد اور طلباہ کی کامیابیوں کے ریکارڈز کو بلاک چین پر محفوز کیا جاتا ہے تو ایک فرد صرف چند سیکنڈ میں درسد،تصدیق شدہ ریکارڈس حاصل کرسکتا ہے۔

۳۔ڈپلومے اور سرٹیفکیٹس: گریڈس کی طرح طلباء کے لیے ڈپلومے اور سرٹیفکیٹ بھی ایک بلاک چین پر فراہم کیے جاسکتے ہیں اور ذخیرہ کیے جاسکتے ہیں۔اس کے بعد آجروں کو کاغذی کاپی کی تصدیق کرنے کے لیے ڈپلومہ جاری کرنے والی ایجنسی کی ضرورت کے بجائے ڈیجیٹل سرٹیفکیٹ کا حوالہ دینے کی ضرورت ہوگی۔اس پر ابھی کام چل رہا ہے۔چونکہ زیادہ تر دستیاب تدریسی اسناد انتظامیہ طلباء کے ڈیٹا کی رازداری اور وعتباریت کی ضمانت دینے سے قاصر ہیں۔اگرچہ اعتماد کے مسائل کو حل کرنے کے لیے بلاک چین کا استعمال ایک قابل عمل حل ہوسکتا ہے لیکن اسمیں ایسی خامیاں ہیں جو اس کے مکمل اختیار کو محدود کرسکتی ہیں۔بلاکچین میں رسائی کا وقت پایا جاتا ہے۔یہ صارفین کو اعلی تعلیم کے لیے ممکنہ آجروں یا اداروں کے لیے جعلی ڈگریوں یا سرٹیفکیٹس کا استعمال کرنے سے روکتا ہے۔

۴۔بیجز: ڈگریوں کے علاوہ ایک معیاری ریزیومے (standard resume) اضافی تفصیلات کا خزانہ فراہم کرتا ہے جو آجر کو مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ہم ان خصوصیات کے بارے میں بات کر رہے ہیں جیسے کہ غیر ملکی زبان کی مہارت،انجینئرنگ کی قابلیت یا منفرد ہنر جو کسی کے پیشے سے فطری طور پر متعلقہ نہیں ہیں۔تاہم ان صلاحیتوں کو ثابت کرنا مشکل ہے۔تاہم کوئی فرد اپنی اہلیت کی توثیق کرنے اور ایک سند یا بیج (credential or badge) جاری کرنے کے لیے فریق ثالث کے پیشہ ور کی خدمات حاصل کرسکتا ہے۔اگر یہ بلاک چین پر محفوظ ہیں تو ان کا استعمال یہ ظاہر کرنے کے لیے کیا جا سکتا ہے کہ ایک فرد کے پاس ضروری مہارتیں ہیں۔اوپن بیج پاسپورٹ (Open Badge Passport) مثال کے طور پر اس سمت میں پہلا قدم ہے۔

۵۔طالب علم کا امتحان اور تشخیص: طالب علم پرسنل کمپیوٹرز یا سمارٹ فونز کا استعمال کرتے ہوئے دور سے ٹیسٹ دیں گے جس میں Blockchain تشخیص کرے گا۔اساتذہ کے پاس دوسرے علمی یا

ثقافتی کاموں کے لیے زیادہ وقت ہوتا ہے اگر انہیں گریڈ ٹیسٹ دینے کی ضرورت نہ ہو۔اساتذہ درست جوابات کی وضاحت اور تشخیص کے لیے اسکورنگ کے معیار کے ساتھ سمارٹ کنٹریکٹ(smart contract) اور بلاک چین کا استعمال کر سکتے ہیں۔اس کے بعد طالب علم اپنے پرسنل کمپیوٹر یا ڈیوائسز پر امتحان کے لیے حاضر ہوں گے۔طلباء کی تعلیمی کامیابی، تیاری، ٹورنامنٹس ،کام اوراسکول سے باہر دیگر تقریبات میں تعلیمی کامیابیوں کو بلاکچین ٹیکنالوجیز کا استعمال کرتے ہوئے ان کی صلاحیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس سے طلباء اور کاروبار دونوں کو فائدہ ہوتا ہے جو ان کی خدمات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ایک بلاکچین پر مبنی طالب علم کی تکنیکی مہارت کی تشخیص کا نظام جو کلسٹرنگ الگورتھم(clustering algorithm) کا استعمال کرتے ہوئے طلباء کی قابلیت کی پیمائش کے طریقوں کی جانچ کر سکتا ہے۔ یہ فریمورک طالب علم کی مہارت کی تشخیص کے ماحولیاتی نظام کی ترقی کی بھی اجازت دے سکتا ہے۔

۶۔اسباق اور کورسز: بہت سے بلاک چینز سمارٹ معاہدوں (Smart Contracts) کی بھی حمایت کرتے ہیں۔ یہ اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ اسباق اور کورسز کو بلاکچین میں کوڈ کیا جا سکتا ہے اور جب ان معیارات کا سامنا ہوتا ہے تو انہیں خود بخود چلایا جا سکتا ہے۔ایک انسٹرکٹر طلباء کو اسائنمنٹ تفویض کر سکتا ہے۔ Blockchain پر سمارٹ معاہدے ہر مشن کی خود بخود تکمیل کی تصدیق کر سکتے ہیں۔اساتذہ کو تمام اسائنمنٹس مکمل کرنے کے لیے کرپٹوٹوکنز(Crypto Tokens) میں ادائیگی کی جا سکتی ہے اور طلباء کریڈٹ حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ طریقہ پوری کلاسز کو ترتیب دینے کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

۷۔شناخت: سیکھنے کے ایپس(learning apps) اور خدمات کے پھیلاؤ کے ساتھ شناخت کا انتظام تعلیم میں اہم ہوتا جا رہا ہے۔ uPort جیسے پلیٹ فارم صارفین کو اپنی شناخت اپنے ساتھ لے جانے، نیٹ ورک پر اپ لوڈ کرنے اور آسانی سے قابل رسائی میں مدد کرتے ہیں۔تعلیم میں شناخت کا انتظام بہت اہم ہے۔ یہ اسکولوں کو اس قابل بناتا ہے کہ:

☆ متعدد نظاموں تک مؤثر رسائی کی سہولت فراہم کریں جیسے کہ بلنگ، کینٹین کا استعمال، لائبریری سے کتابیں چیک کرنا وغیرہ۔

☆ ریاستی اور قانونی ریگولیٹری کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کریں۔

☆ عملے اور طلباء کو جدید ترین آئی ٹی سسٹم پیش کریں۔

☆تعلیمی اسناد کو محفوظ رکھیں۔

طالب علم کی شناختی دستاویز کو ذخیرہ کرنے کے بجائے بلاکچین اس دستاویز کے بارے میں معلومات محفوظ کرتا ہے۔ بلاکچین کا استعمال کرتے ہوئے طلباء اپنے ذاتی ڈیٹا کے ذخیرہ اور انتظام پر کنٹرول برقرار رکھتے ہوئے خود کو آن لائن پہچان سکتے ہیں۔

۸۔ حاضری اور اسائنمنٹ کی تکمیل سے باخبر رہنا: بلاکچین طلباء کے ڈیٹا کو محفوظ بناتا ہے اور طلباء کی حاضری، اسائنمنٹ کی تکمیل سے باخبر رہنے وغیرہ کے لیے معلومات کی بازیافت کے عمل کو بہتر بناتا ہے۔ چونکہ بلاکچین نیٹورک طلباء اور ان کی کامیابیوں کے بارے میں تمام معلومات محفوظ کرتے ہیں اس لیے سیکھنے اور دیگر سرگرمیوں میں پیشرفت کو ٹریک کرنا ممکن ہے۔ طویل مدت میں یہ تعلیمی اداروں کو تعلیمی عمل میں ضروری تبدیلیاں کرنے میں رہنمائی کرے گا۔

۹۔ انفراسٹرکچر سیکیورٹی: فی الحال تعلیمی ادارے اپنے نیٹ ورکس کو ہیکرز سے بچانے کے لیے چیلنج کا سامنا کر رہے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ہی ذکر کیا گیا ہے بلاکچین ٹیکنالوجی ایک محفوظ نیٹ ورک پیش کرتی ہے اور بلاکچین میں محفوظ معلومات کو جعلی بنانا ناممکن ہے۔ Xage جیسی کمپنیاں بلاکچین کا چھیڑ چھاڑ پروف لیجر استعمال کر رہی ہیں جو ہر عنصر کی حفاظت کرتی ہے۔ اس میں نئے اور میراثی نظام شامل ہیں اور یہ متحرک ڈیٹا سیکیورٹی کو فعال کر کے ہر تعامل کو محفوظ بناتا ہے۔

۱۰۔ مؤثر ڈیٹا اسٹوریج: تعلیمی ادارے ان دنوں پہلے سے کہیں زیادہ ڈیٹا ذخیرہ کر رہے ہیں۔ تقسیم شدہ لیجر ٹیکنالوجی کلاؤڈ (Distributed Ledger Technology) اسٹوریج دیٹا کو زخیرہ کرنے اور بازیافت کرنے کے لیے محفوظ اور ممکنہ طور پر سستا متبادل پیش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر (File coin) فائل کوائن ایک ہائی پروفائل کرپٹو پروجیکٹ ہے جو فائلوں کی میزبانی کا بدلہ دیتا ہے۔ یہ دنیا کو ایک نئے سٹوریج ماڈل" ہائپر۔لوکل اور موثر اسٹوریج" کے ساتھ جوڑتا ہے۔

۱۱۔ ریکارڈز مینجمنٹ کی آسانیاں: بلاک چین ٹیکنالوجی کاغذ پر مبنی عمل کو ختم کرتی ہے اور ریکارڈ کے انتظام کو آسان بناتی ہے۔ یہ طلباء کے سرٹیفکیٹس، ڈگریوں اور نقلوں جیسے ریکارڈز کے لیے موزوں سے زیادہ ہے۔ ریکارڈز کو خفیہ کرنے کے علاوہ بلاکچین ایک طالب علم کے تجربات کی وسعت کو دستاویزی بنانے اور ٹریک کرنے کا ایک ذریعہ پیش کرتا ہے۔

۱۲۔ نیکسٹ جنریشن لائبریری پلیٹ فارم: بلاک چین کو اگلی نسل کے لائبریری پلیٹ فارم میں ایک بنیاد کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ معلومات کو جمع کرنے، ٹریک کرنے اور ذخیرہ کرنے کا ایک بہت

زیادہ مئوثر اور آسان طریقہ پیش کرتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا فائدہ ہے جسے اسکولوں میں لائبریری اور معلوماتی خدمات کو بہتر بنانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔مثال کے طور پر سان جوس اسٹیٹ یونیورسٹی اسکول(San Jose State University School) نے معلوماتی پیشے کے لیے بلاکچین ٹیکنالوجی کی صلاحیت پر کام کرنے کے لیے کافی گرانٹ حاصل کی ہے۔

نتیجہ: بلاک چین ٹیکنالوجی ایک تیزی سے ترقی کرنے والی ٹیکنالوجی ہے۔آج ہم تعلیم میں اس کے وسیع فوائد کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔تعلیم کا شعبہ مختلف نظاموں پر مشتمل ہے۔ یہ نظام طلباء کو روزگار کے لیے تیار کرنے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔ بلاک چین ٹیکنالوجی پہلے سے طے شدہ سیکھنے کے مسائل سے نمٹنے اور تعلیمی قابلیت میں ایمانداری کو یقینی بنانے کے لیے ضروری ہے۔امید افزا مستقبل کے ساتھ ایک نئی ٹیکنالوجی کے طور پر بلاک چین یہاں رہنے کے لیے ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ اویانگ ایس۔، ہوانگ ایکس اور ترونا گرے ایس۔(2022)۔ بلاکچین ٹکنالوجی پر مبنی تعلیمی تشخیص کا انتظام۔ *موبائل انفارمیشن سسٹمز*۔ 2022۔ آن لائن اشاعت کی تاریخ: 1۔جنوری۔2022۔https://doi.org/10.1155/2022/7513365

۲۔صابری، ایس ایس، کیتن، این ایم اور مجید، آئی۔(2019)۔ بلاکچین ٹکنالوجی کا راستہ: تصور اور اقسام۔*انجینئرنگ اور نیچرل سائنسز کے دوار*(PEN)،7(4)،1821۔1832۔

۳۔ ہاشمانی، ایم اے، جونیجو، اے زیڈ، العبدالطیف،، اے اے اور عادل، ایس ایچ (2020، اکتوبر)۔تعلیم میں بلاکچین – قابلیت اور سراغ لگانے کی صلاحت۔2020 میں بین الاقوامی کانفرنس آن کمپیوٹیشنل انٹیلی جنس (ICCI)(صفحہ ۴۰۔۴۴)۔آئی ای ای ای۔

۴۔صدیقی ایس، احمد ایم، خمر الدین ایم، گپتا اے اور سنگھا اے(2022)۔Blockchain اور IoT برائے تعلیمی سرٹیفکیٹس کی تیاری اور تصدیق۔2022 کمپیوٹنگ اور انفارمیشن ٹیکنالوجی پر دوسری بین الاقوامی کانفرنس(ICCIT)۔ (صفحہ 40۔44)۔آئی ای ای ای۔

☆☆☆

Abr-e-Sitam : Ek mutalea by Dr. Md. Wasimuddin (Madhepura)

ڈاکٹر محمد وسیم الدین (مدھے پورہ) cell- 9661121900

ابر ستم: ایک مطالعہ

'ابر ستم' ڈاکٹر زبیر فاروق العرشی کا ایک اہم شعری مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا تعلق دبئی سے ہے اور وہ ایسے پہلے عرب شاعر ہیں جن کا پورا دیوان اردو میں موجود ہے۔ اس طرح وہ اردو کے پہلے صاحب دیوان عرب شاعر ہیں۔ اس وقت ان کے شعری مجموعوں کی تعداد 100 سے زاید ہے ۔کئی مجموعے ہندی اور انگریزی میں بھی شائع ہوئے ہیں لیکن ان کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں کہ اس متعلق بہت سی تحریریں خود ان کے شعری مجموعوں میں اور ان پر لکھے گئے بہت سے مضامین میں درج ہے۔ یہاں ان کے شعری مجموعے ابر ستم کا مطالعہ مقصود ہے جو کئی اعتبار سے اردو کے اہم شعری مجموعوں میں شامل کئے جانے کا مستحق ہے۔

"ابر ستم" کا مطالعہ کیا جائے تو ایک بات جو ذہن میں آتی ہے۔ وہ سماج سے ڈاکٹر زبیر فاروق العرشی کی ذہنی زندگی کے انسلاک کی جانب توجہ دلائی ہے جس پر غور وخوض کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سماج کے نشیب وفراز کو سمجھنے کی کاوش کی ضمن میں ان کی اپنی علیحدہ فکر ہے جو صاف زبان میں پیچیدہ بیانی، کہیں پیچیدہ زبان میں صاف بیانی اور کہیں صاف بیان میں صاف بیانی کے ہنر کو نمایاں کرتی ہے۔ مثال کے طور پر حمد کا مطلع دیکھئے ؎

خدا کو ذہن و دل سے ہم اگر تسلیم کر پاتے تو پھر ہم اپنے حصے کوثر و تسنیم کر پاتے

حمد کا ہی ایک اور شعر ہے ؎

بہت عزت کماتے دوسروں سے، رہ کے دنیا میں اگر ہم آپ اپنی تھوڑی سی تعظیم کر پاتے

غور کیا جائے تو ان دونوں اشعار کی معنوی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ خدا کو ذہن و دل سے تسلیم کر پانا اور اشرف المخلوقات ہونے کے منصب کو سمجھنا اور اس کی تھوڑی سی تعظیم کر پانے کے بظاہر سہل ممتنع کے اظہار میں وہ جہان معنی آباد ہے کہ پرت در پرت تہیں کھلتی جائیں اور انسانی دماغ اس نقطۂ نظر سے جہاں تک چاہے، جہاں تک اس کی صلاحیت پہنچے، سوچوں کا سفر در سفر کرتا

رہے۔اسی قبیل کا معنوی سلسلہ ان کے دوسرے اشعار میں بھی نظر آتا ہے۔

ایک اٹوٹ سا رشتہ ہے ہم لوگوں میں فاروق ہم اہل غم پر مرتے ہیں، اہل غم ہم پر
آگ نفرت کی جل رہی ہے کہیں اور پھیلا دھواں ہمارے بیچ
بس ایک ہی جگہ پہ ہے اٹکا ہوا دماغ سوچوں کی سولی پہ ہے کیوں لٹکا ہوا دماغ
تاج محل ہے جیسے سنگ مرمر کی پہچان اسی طرح ہے مہر و محبت ہر گھر کی پہچان
پھر بھی برہنگی تھی کہ ہوتی گئی عیاں گو تن کو ڈھانپ رکھا تھا سب نے لباس سے

مندرجہ بالا تمام اشعار میں صاف زبان میں کتنے پیچیدہ موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے جو کہ منفرد نہیں بلکہ ایک جماعت کی مانند ذہن و دل کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر زبیر فاروق العرشی نے جو مثالیں پیش کی ہیں مثلاً تاج محل کو سنگ مرمر کی پہچان قرار دینا، وہ خود میں جتنی انوکھی ہیں، اتنی ہی معنی خیز بھی ہیں۔ دماغ کو ردیف کے طور پر استعمال کرنا اور اسے آج کے گلوبل گاؤں کے بظاہر متغیر اور بہ باطن محض نفع اور نقصان کی سولی پر اٹکے اور اسی محور پر گردش کرتے رہنے کی اذیت کو انہوں نے کتنی ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان اشعار میں کسی کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کوئی ہنگامی واقعے یا کامپلکس کی پیداوار ہیں بلکہ ان کا مستحکم تعلق ماضی کی جڑوں سے بھی ہے جن میں نشوونما پانے کے بعد خواہ وہ مثبت ہوں یا منفی حال اور مستقبل کو متاثر کر رہے ہیں۔ وزیر آغا کے الفاظ یاد آتے ہیں:

''ادب کا نہایت گہرا رشتہ اجتماعی لاشعور سے ہے اور یہ ان آرکی ٹائپل امیجز میں اپنا اظہار کرتا ہے جو نسل انسانی کا مشترکہ چلن ہیں نہ کسی شخص کا شخصی رویہ۔۔۔۔۔۔اس کا بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ آرکی ٹائپل امیجز کی موجودگی یا عدم موجودگی سے اس بات کا تجزیہ ہونے لگا کہ کوئی تخلیق محض ہنگامی واقعے یا کامپلکس کی پیداوار ہے یا پھر اس کی جڑیں ماضی میں اتری ہوئی ہیں۔''

(بہ حوالہ کمان اور زخم۔از فضیل جعفری، ص ۱۶۴)

ڈاکٹر زبیر فاروق العرشی کے مزید اشعار دیکھے جائیں ؎

ایک قیامت ٹلتی ہے تو دوسری آجائے ہر اک روز ہی مجھ کو روز محشر لگتا ہے
اشکوں کے وقفوں میں ہم نے خود کو خوب ہنسا کے رکھا
کیا عشق ہم نے ہے اس واسطے کسی کام میں کامیابی تو ہو
پرانے دنوں کا نشاں چھوڑ آئے جو ہوتا تھا گھر، وہ مکاں چھوڑ آئے

وقت کا کیا ہم کر لیں گے ہو گیا دودھ بھی پانی جو

مندرجہ بالا اشعار میں نئے خیالات کے ساتھ ساتھ پرانے خیالات کو بھی مختلف انداز سے برتنے کی کوشش کی گئی ہے مثال کے طور پر شعر نمبر ۱ اور ۴۔ دوسرا شعر گہری معنویت کا حامل ہے اور صاف الفاظ میں پیچیدہ بیانی کے ہنر کا آئینہ دار ہے۔ تیسرے شعر میں ڈاکٹر زبیر فاروق العرشی نے عشق کے تصور کو تقریباً الٹ دیا ہے۔ عشق کی کامیابی کو دوسرے عوامل کی کامیابی اور دوسری کامیابیوں کا پیش خیمہ تصور کیا جاتا ہے یا پھر دوسری ناکامیابیوں کے ازالے کے طور پر بھی اس خیال کو برتا گیا ہے۔ لیکن عشق کی معنویت کے اعلیٰ درجے کو ادنیٰ تصور میں پیش کرنا بالکل آج کا تبدیل موضوع ہے جو مابعد جدید رجحان کی نمائندگی کرتا ہے۔ اسی طرح پانچواں شعر دودھ اور پانی کی معنویت کو کتنے رنگ عطا کرتا ہے، اس کی وضاحت میں صفحات سیاہ کیے جا سکتے ہیں۔ مزید اشعار ؎

نفرت سے حقارت سے سدا خود کو میں دیکھوں اب اس کے سوا اور بھی چارا تو نہیں ہے

کوئی بھی آ کے رہ سکتا ہے اس میں بہت ہی دل کشادہ کر لیا ہے

فاروق آسمان تو پہلے سے سر پہ تھا اب کے زمین سر پہ اٹھانی پڑی مجھے

جن کو قبولیت کا رتبہ نہ مل سکا تھا بھٹکی ہوئی دعائیں ہم اب بھی ڈھونڈتے ہیں

کرتا ہے کوئی آج کل پیدل سفر کہاں فاروق کیسے پیروں میں رستے کی دھول ہو

پروفیسر گوپی چند نارنگ مابعد جدیدیت کے تعلق سے فرماتے ہیں:

''ویسے دیکھا جائے تو مابعد جدید چیلنج میں اکیسویں صدی کے قدموں کی چاپ صاف سنائی دے رہی ہے۔ اس کے بہت سے ریڈیکل رویوں کا رخ ہے یہی مستقبل کی طرف۔ جیسے وضاحت کی گئی، وقت سے پہلے آنے والے وقت کی پرچھائیں پڑنے لگتی ہے، گویا بیسویں صدی کی آخری دہائی ہی سے اکیسویں صدی کا عمل دخل شروع ہو چکا ہے۔ ویسے تو نئے منظرنامے کی تشکیل اصلاً نئی پیڑھی کے ہاتھوں ہو رہی ہے لیکن ادب چونکہ ایک سلسلۂ جاریہ ہے، اس میں نیا پرانا ساتھ ساتھ بھی چلتا رہتا ہے بالکل جیسے پریم چند اور ملک راج آنند اور جوش بہت پہلے سے لکھ رہے تھے، پھر یہی لوگ نئے رجحان کے نقیب بھی ٹھہرے، یا جیسے راشد یا میراجی یا آل احمد سرور نے اپنے بعد آنے والی نوجوان نسلوں کا ساتھ دیا۔ اسی طرح

جدیدیت کے بہت سے نامور شعرا اور فکشن لکھنے والوں میں بھی آج سے بہت پہلے تبدیلی آنا شروع ہو چکی تھی اور اندر ہی اندر انہوں نے دونوں طرح کی لیک کو تخلیقی طور پر مسترد کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ عمل وقت کے ساتھ ساتھ روشن ہو رہا ہے۔''

(اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ۔ مرتبہ: پروفیسر گوپی چند نارنگ، ص ۶۸)

میرے خیال میں اس پورے اقتباس میں جو سب سے اہم بات ہے وہ اکیسویں صدی میں مابعد جدید چیلنج کی ہے۔ اب ڈاکٹر زبیر فاروق العرشی کے مندرجہ بالا اشعار پر غور کیا جائے تو ان کے یہاں جدید تر شاعری کی صورت میں ان مابعد چیلنجوں کو بھی احاطۂ تحریر میں لایا گیا ہے۔ ان کے مزید اشعار پر غور کیا جائے ؎

اپنی بینائی گنوا دے نہ کہیں ایسے میں — روشنی اتنی مرے یار نہ رکھ آنکھوں میں

کھولتا رہتا تھا جو جذبات میں — زہر وہ سارا زباں میں آ گیا

یہ خوش فہمی ہے، خوش خیالی ہے یہ — نئی سوچ دیدہ وروں میں ملے

میں شہر یار انا تھا، مگر محبت نے — بنا کے رکھا ہمیشہ کسی کا داس مجھے

مٹ مٹا جانا ہے ایک لمحے میں سب — اب تو قسمت ہے تحریر دیوار پر

مندرجہ بالا تمام اشعار مابعد جدید اشعار ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ استدلال کے لیے پروفیسر گوپی چند نارنگ کا یہ اقتباس نقل کرتا ہوں:

''مابعد جدیدیت ایک تاریخی دور بھی ہے جس میں دنیا داخل ہو چکی ہے اور اردو زبان بھی خواہ کسی ملک میں ہو، اس سے باہر نہیں۔ برقیاتی میڈیا کی یلغار سے پوری دنیا زیر و زبر ہو رہی ہے۔ نئی تکنیک ایجادات، مصنوعی سیاروں، ترسیل و تبلیغ کی بڑھتی ہوئی سہلوتوں، کمپیوٹر تکنالاجی، کمرشیل تقاضوں، صارفیت کی ریل پیل اور منڈی معیشت نے جہاں بظاہر نئی ترقیوں کے دروازے کھول دیے ہیں، وہاں مسائل بھی پیدا ہو رہے ہیں جن کا کوئی آسان حل سامنے نہیں ہے۔ فیصلوں کی طاقت اب 'سیاسی قدر' سے زیادہ 'کمرشیل قدر' کے ہاتھوں میں آ گئی ہے۔ یہ معمولی تبدیلی نہیں۔ جس 'انفارمیشن ہائی وے' کا چرچا ہے، ہم سب اس کی زد میں ہیں۔ خرید و

فروخت، حصول علم، تجارت، ترسیل سب پر اس کا اثر پڑ رہا ہے جب پوری زندگی، سماج کا ڈھانچہ، انسان کے رویے اور ثقافتی ترجیحات ہر چیز بدل رہی ہے تو کیا زبان و ادب اس فضا سے الگ ہیں۔''

(اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ۔ مرتبہ: پروفیسر گوپی چند نارنگ، ص ۴۵)

مندرجہ بالا اقتباس کے نقل کے بعد میرے خیال میں مزید وضاحت کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ ڈاکٹر زبیر فاروق العرشی کا شعری ذہن وقت اور حالات پر گہری نظر رکھتا ہے اور جب ان کے خیالات صفحہ قرطاس پر رقم ہوتے ہیں تو بہترین شاعری وجود میں آتی ہے۔

☆☆☆

Urdu Nazm ka Rujhan : 1947 se 60 ki dahaayi tak by Dr. Mohd. Mustafa (Katihar) cell-9508438198, 9472924715

ڈاکٹر محمد مصطفیٰ (کٹیہار)

اردو نظم کا رجحان: 1947 سے 60 کی دہائی تک

اس بات سے شاید کسی کو انکار نہ ہو کہ 1947 میں حصول آزادی اور تقسیم ہند کے جو اثرات زندگی اور سماج پر مرتب ہوئے، اس سے ادب بھی اچھوتا نہیں رہا۔ جہاں ملکی سطح پر ایسی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں جو ایک عجیب صورت حال کو نمایاں کر رہی تھیں اور جن کا شاید گمان بھی شاعروں اور ادیبوں کو نہیں تھا کہ ماحول و حالات یکسر ان کی تخلیقات کا عنوان بدل دیں گے۔ اس حوالے سے بہت کچھ لکھا بھی جا چکا ہے، وہیں عالمی صورت حال کی تبدیلیاں بھی زندگی کی کشمکش کو مزید پیچیدہ بنانے میں کوئی کور کسر نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ ترقی یافتہ ملک دوسری جنگ عظیم میں اپنے ہو چکے خسارے کو پورا کرنے کے لئے اور ترقی پذیر اور پس ماندہ ملکوں کو دوسرے طریقوں سے غلام بنانے کی ترکیبوں اور عملیات میں مصروف تھے اور ہمارے ملک کے اندرونی حالات ایسے بنے ہوئے تھے کہ ہم ترقی یافتہ ملکوں کی طرح بہت کچھ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

دوسرے زہین لوگوں کی طرح اردو کے شاعر اور ادیب بھی محسوس کر رہے تھے کہ موجودہ صدی کے آغاز سے ہی سائنس کی ایجادات جو کہ ترقی یافتہ ملکوں کی سب سے بڑی طاقت تھی اور ترقی پذیر ملک جن سے اکثر محروم تھے، کی برق رفتاری نے ملکوں کی دیواروں اور وقت کے فاصلوں کو مٹانا شروع کر دیا ہے۔ سائنس اور ٹکنولاجی کے جارحانہ رویوں کے مقاصد اور منصوبوں کو محسوس کرتے ہوئے ہی شاید علی سردار جعفری نے لکھا:

رواں ہے وقت کے پر ہول رہگزاروں پر — ہزاروں سال کے درماندہ رہروانِ حیات
نہ کوئی منزلِ آسودگی نہ راہ نجات — طویل نظم کا صحرا، طویل جبر کا دشت
یہ آفتاب سر آسماں پہ آگ کا تشت — افق سے تا بہ افق ہے ہوائے گرم کا گشت
نہ کوئی سایہ کہیں ہے نہ کوئی پرچھائیں — شجر ہوا میں اڑے جاتے ہیں دھواں ہو کر

ہر ایک سمت صدا دے رہے ہیں سناٹے خموشی بولتی ہے خوف کی زباں ہو کر (سناٹا)

اس پوری نظم کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ایک طرف ہزاروں سال کے درماندہ رہروان حیات جو شاید ذہنی اور جسمانی طور پر یا ان پر ہول رہگزاروں پر چلنے کو یا تو تیار نہ تھے یا راضی نہ تھے لیکن زبردستی چلائے جا رہے ہیں یا زبردستی چلے جا رہے ہیں۔اس سے نجات کی کوئی صورت بھی دکھائی نہیں پڑتی اور ضمیر ابھی بے ضمیری کی اس منزل تک بھی نہیں پہنچا ہے جو آسودگی کا احساس دلا سکے۔یہ دوہری اذیت صحرا کی طویل نظم اور دشت کے طویل جبر کی مانند ہے جس سے کوئی مسافر یا یوں کہیں کہ مفلس اور کمزور مسافر دوچار ہوتا ہے۔ان ترقی پذیر اور پس ماندہ ملکوں اور قوموں کے افراد جو زندگی کا سفر بس کئے جا رہے ہیں اور جن کے لئے راہ نجات شاید موت ہے یا وہ بھی نہیں کہ ان کی آنے والی نسلیں بھی دوسروں کے اقتدار میں دبی رہیں گی۔یہ آفتاب جو جابر قوموں اور ترقی یافتہ ممالک کے لئے روشنی، جوش اور قوت کی علامت ہے، ان کے لئے ایک ایسی آگ کا تشت ہے جو ان کو جھلسا رہا ہے۔اور وہ ہوا جو جابر قوموں اور جابر ملکوں کے لئے فرحت بخش ہے، وہ ان مظلوموں پر آفتاب کے ساتھ سے اتنی گرم ہو کر ان کے اردگرد ایسے دگشت کر رہی ہے جیسے وہ جابر ملکوں کی جاسوس ہو۔اسی لئے ان کو نہ کہیں سایہ نصیب ہو رہا ہے اور نہ اپنی پرچھائیں یعنی کوئی اپنا ہمدرد بھی یا تو اپنے مفاد میں یا ان کے خوف میں ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ان کے ملک کے قیمتی درخت اور دوسرے وہ خزانے جو قدرت نے انہیں عطا کئے ہیں، وہ بھی ان کے لئے ہوا میں اڑ جانے کے مانند ہیں کہ انہیں اس کا یا تو بہت کم فائدہ مل رہا ہے یا پھر فائدہ مل ہی نہیں رہا ہے، بس پیٹ پالنے کے لئے ایک چھوٹا روزگار مل گیا ہے۔گھٹن بھری زندگی اور ابتر رہن سہن کا ہولناک سناٹا جہاں نہ اچھی زندگی اور رہن سہن کی امید باقی رہ گئی اور نہ اس کو اپنے طور حاصل کر لینے کی جراءت اس لئے ان کی خموشی اس خوف کی زبان بن کر بولتی ہے جو ان کے ذہن و دل پر مسلط ہے۔

علی سردار جعفری کی مندرجہ بالا نظم جس کا عنوان "سناٹا" ہے 1947 کے بعد کی بدلتی ملکی اور عالمی صورت حال کی نہ صرف بہترین عکاسی کرتی ہے بلکہ اردو نظموں میں برتے جانے والے جدید تخیلات کی بھی آئینہ داری کرتی ہے۔ان تخیلات کو تخلیق کی صورت میں ڈھالنے میں جن کا کہ شاید اب وہ اثر نہ ہو جیسا کہ "حسن کا معیار" بدلنے کے وقت ہوا تھا۔وجہ شاید یہ کہ اس وقت اس طور کی بے حسی شاید عوام و خواص میں نہ تھی۔تخلیق کے اس کرب کو علی سردار جعفری نے اپنی ایک نظم جس کا عنوان "شاعر" ہے، میں یوں بیان کیا ہے۔

میں کہ ہوں اشک کا ایک موتی
درد کے نیلے رخسار پر
خونِ ناحق کی اک بوند سفاک تلوار پر
ایک بے تاب بوسہ
ان لبوں پر جو بوسوں سے محروم ہیں
اک تبسم کی بے باک و روشن کرن
خنجروں کی چمک کے مقابل
اک نعرہ ہوں میں
ایک پرچم ہوں میں
اک سمندر کا بے ساختہ قہقہہ
اور ان کے سوا
یعنی کچھ اور بھی
جس کو اک لفظ" شاعر" نئی معنویت عطا کر رہا ہے
گیت کے روپ
نغمے کا پیکر (شاعر)

اس نظم میں بھی فکر و احساس اور اظہار و بیان کے نئے امکانات کی تلاش کا رجحان موجود ہے۔اس بات سے شاید کسی کو انکار نہ ہو کہ اردو نظم اپنے ابتدائی دور سے ہی دوسری نظمیہ اصناف کا اثر لئے ہوئے رہی جو اس کی شناخت مے معاملے میں بھی کئی جہتیں رکھتا ہے۔لیکن آزاد نظم وغیرہ کی جدید ہیت نے انگریزی ،فرانسیسی ،جرمن اور جاپانی وغیرہ تخلیقی نظریات و موضوعات کے زیر اثر ایرانی زبان و خیال کے تصورات کو بہت حد تک کم کر دیا۔روایت کی اسیری جو شاید سیاسی محکومی اور معاشرتی پستی کے بطن سے پیدا ہوئی تھی وہ زندگی کے اصل حقائق ،اس کے حقیقی مسائل کی جانب توجہ کرنے میں مانع تھی جس سے ایک طرف جہاں ادبی موضوعات کے طور پر زندگی کے حقائق محو تھے تو دوسری طرف خود کے انفرادی و اجتماعی مسائل کا حل ترقی پسندی کے پہلے پند و نصائح کے موضوعات میں تلاش لیا گیا تھا۔لیکن ترقی پسند رجحان کے ساتھ مارکسیزم اور دوسرے یوروپی ادبی نظریات سے متاثر ہونے اور چونکہ وہاں کے ابتر لوگوں کی حالت اور یہاں کے لوگوں کی حالت ایک سی ہی تھی۔

یوں بھی دنیا کے ہر ملک کے ابتر باشندوں کی حالت چاہے وہ کسی ترقی یافتہ ملک کا ہو یا ترقی پذیر یا پس ماندہ ملک کا، ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔ ان نظریات کے زیر اثر جن موضوعات کا اردو نظم میں اضافہ ہوا ان میں خود احتسابی، اجتماعیت کے ساتھ انفرادی ذہن کی کشمکش اور ان کے مختلف خیالات و تصورات نے پند و نصائح اور اصلاحی مضامین کی جگہ لے لی۔ تبدیلی کا یہ رویہ مذہبی عقائد اور اس کے فرائض کی دوری کی صورت میں بھی سامنے آیا۔ اس کا جو نتیجہ بہت سی جگہوں پر سامنے آیا اور سامنے آ رہا ہے، اختر الایمان کی ایک نظم جس کا عنوان "مسجد" ہے، اس کی بین مثال ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:

ایک ویران سی مسجد کا شکستہ سا کلس — پاس بہتی ہوئی ندی کو تکا کرتا ہے
گرد آلود چراغوں کو ہوا کے جھونکے — روز مٹی کی نئی تہہ میں دبا جاتے ہیں
اور جاتے ہوئے سورج کے وداعی انفاس — روشنی آ کے دریچوں کی بجھا جاتے ہیں
ایک میلا سا اکیلا سا فسردہ سا دیا — روز رعشہ زدہ ہاتھوں سے کہا کرتا ہے
اور ندی کی ہر ایک موج تلاطم بردوش — چیخ اٹھتی ہے وہیں دور سے فانی فانی
میں بہالوں گی تجھے توڑ کے ساحل کے قیود — اور پھر گنبد و مینار بھی پانی پانی (مسجد)

1960 کے تھوڑا پہلے یا آس پاس جدیدیت کے رجحان کے تحت جو علامتی نظمیں تخلیق کرنے کا ماحول قائم ہوا، اس کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر ویران مسجد کا شکستہ کلس، پاس بہتی ہوئی ندی، گرد آلود چراغ، مٹی کے جھونکے جو چراغ کو مٹی کی نئی تہہ میں دبا جاتے ہیں، جاتے ہوئے سورج یعنی گزرتے ہوئے دنوں کے وداعی انفاس جو دریچوں کی روشنی کو بجھا جاتے ہیں، رعشہ زدہ ہاتھ، اکیلا فسردہ سا دیا، جلانے کے بعد بجھانا بھول جانا، دئے کا خود بجھنا، ندی کی موج تلاطم بردوش کا دور سے ہی چیخ اٹھنا کہ میں ایک دن ساحل کی قیود یعنی تمام سماجی و قانونی بندشیں توڑ کر تجھے بہالے جاؤں گی اور پھر گنبد و مینار کا وجود باقی نہ رہنا۔ ان تمام مناظر کو ایک پیکر میں، ایک ہیت میں ایک صورت دے کر علامتی فہم و ادراک کو کام میں لاتے ہوئے اس نظم کا مطالعہ کیا جائے تو یہ کس قدر معنی خیز ہے شاید بتانے کی ضرورت نہیں۔ اختر الایمان نے اپنے شعری مجموعے "آب جو" میں اپنے تخلیقی ذہن کے بارے میں جو گفتگو کی ہے، وہ اس وقت کے تمام سنجیدہ تخلیقی نظم نگاروں کے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ چند سطریں ملاحظہ ہوں:

"یہ شاعری ایک ایسے انسانی ذہن کی تخلیق ہے جو دن رات بدلتی ہوئی سیاسی، معاشی اور اخلاقی قدروں سے دو چار ہے، جو اس معاشرہ اور سماج میں زندہ ہے جسے آئڈیل نہیں کہا جا سکتا۔

جہاں عملی زندگی اور اخلاقی قدروں میں ٹکراؤ ہے، تضاد ہے۔ جہاں انسان کا ضمیر اس لئے قدم قدم پر ساتھ نہیں دے سکتا کہ زندگی ایک سمجھوتے کا نام ہے، اور سماج کی بنیاد اعلیٰ اخلاقی قدریں نہیں، مصلحت ہے اور ضمیر کو چھوڑا اس لئے نہیں جا سکتا کہ اگر انسان محض حیوان ہو کر رہ گیا تو اعلیٰ قدروں کی نفی ہو جائے گی۔" (آب جو)

اختر الایمان کے مندرجہ بالا بیان میں اردو نظم کے رجحان میں تبدیلی کے شواہد بخوبی موجود ہیں۔ ان کی ایک نظم" شیشے کا آدمی" کا مطالعہ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اٹھاؤ ہاتھ کہ دست دعا بلند کریں ہماری عمر کا اک اور دن تمام ہوا
خدا کا شکر بجا لائیں آج کے دن بھی نہ کوئی واقعہ گزرا نہ ایسا کام ہوا
زباں سے کلمۂ حق راست کچھ کہا جاتا ضمیر جاگتا اور اپنا امتحاں ہوتا
خدا کا شکر بجا لائیں آج کے دن بھی اسی طرح سے کٹا منھ اندھیرے اٹھ بیٹھے
پیالی چائے کی پی ،خبریں دیکھیں ناشتے پر ثبوٹ بیٹھے بصیرت کا اپنی دیتے رہے
بخیر و خوبی پلٹ آئے جیسے شام ہوئی اور اگلے روز کا موہوم خوف دل میں لئے
ڈرے ڈرے سے ذرا بال پڑ نہ جائے کہیں لئے دئے یوں ہی بستر میں جا کے لیٹ گئے

(شیشے کا آدمی)

اسی طرح اردو ادب میں ایسی بہت سی مثالیں نظم گو شعرا کے یہاں وافر تعداد میں موجود ہیں جو اردو نظم کے 1947 سے 60 تک کے تخلیقی رجحان کی آئینہ داری کرتی ہیں۔

☆☆☆

Akhtar Orinvi ki Novel nigari by Mohd. Naim Raza(Research Scholar
Dept. of Urdu Tilka Manjhi Bhagalpur University, Bhagalpur)
محمد نعیم رضا (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو تلکا مانجھی بھاگل پور یونیورسٹی، بھاگل پور، بہار)

اختر اورینوی کی ناول نگاری

زمانے نے ادیب اور فنکار سے کہانی کی ایک ایسی صنف کا تقاضا کیا تھا جو رومان کی رنگینیوں کے بجائے زندگی کی سادہ و پُر پیچ حقیقتوں کی حامل ہو۔ یعنی ایک ایسی صنف جس میں فنکار کا تخیل اور اس کے تصور کی جدت پسندی نہیں، بلکہ تفکر کی گہرائی شامل ہو۔ جس میں انسان زندگی کی تلخیوں سے گھبرا کر ایک ان دیکھی دنیا کی سیر کرنے کی جگہ اس کی کشمکشوں سے دو چار اور نبرد آزما ہو، جہاں اسے زندگی سے فرار کی نہیں اس سے الجھنے اور اس کی الجھنوں کو سلجھانے کی تعلیم ملے اور جہاں فنکار محض مصور نہیں بلکہ مبصر، نقاد اور معلم کے فرائض اور منصب پورا کرنے کی خدمت انجام دے۔ نیز جہاں جذبات اور احساسات پر فن کی منطق حاوی اور غالب نظر آئے۔ زمانے کی اسی طلب اور حالات کے اسی تقاضے نے ادب میں "فنِ ناول نگاری" کو وجود بخشا۔ ناول اس کہانی کو کہتے ہیں جس میں انسانی زندگی سے متعلق کسی بھی اہم اور دلچسپ واقعہ کو تفصیل کے ساتھ اس طرح بیان کیا جائے کہ قاری کے لیے وہ فرحت و مسرت اور بصیرت و آگہی کا باعث بن سکے۔ انسانی زندگی ناول کا بنیادی مقصد و موضوع ہے۔ ناول نگاری کے لیے حقیقت نگاری بنیادی چیز ہے۔ اس میں فرضی اور خیالی چیزوں سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ اصل میں ناول داستان کی ارتقائی شکل ہے اور اس میں انسانی زندگی کی تصویر کشی فنکارانہ انداز میں کیا جاتا ہے۔

اختر اورینوی (سابق صدر شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی) ایک مایہ ناز علمی و ادبی شخص تھے۔ ان کے مایہ ناز علمی و ادبی شخصیت ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ان کی شخصیت کی تہہ داری اور کثیر الجہاتی ہے۔ وہ صرف ایک مایہ ناز شخصیت ہی نہیں، بلکہ کثیر الجہات شخصیت تھے۔ ایک اختر؟ اورینوی میں مختلف علوم و فنون اور نوع بہ نوع اوصاف و کمالات کے ماہ و اختر جمع تھے۔ اردو میں "کثیر الجہات شخصیت" کا اطلاق اب عام ہو گیا ہے اور معمولی علمی و ادبی صلاحیتوں کے حامل افراد کو بھی یہ اعزازی

تمغہ دے دیا جاتا ہے۔لیکن اختر اورینوی صحیح معنوں میں " کثیر الجہات شخصیت " تھے۔ایک شخص با کمال استاد، اخلاص پیشہ معلم،سینکڑوں تلامذہ کے محسن و مربی، صاحبِ طرز ادیب، اعلیٰ انشا پرداز، قادرالکلام شاعر، بے مثال ناقد، بلند پایہ محقق، کامیاب افسانہ نگار، منفرد ڈراما نگار اور بے مثال ناول نویس ہوتو اس کو " کثیر الجہات شخصیت " کہنا ہر اعتبار سے معقول اور درست بات ہے۔ پروفیسر عبد المغنی نے بجا کہا ہے:

۴۵ / سال کے اختر اورینوی ربع صدی (پچیس سال) سے زائد عرصے سے گیسوئے اردو کی شانہ آرائی کر رہے ہیں۔ اختر اورینوی کی زندگی شش جہات تھی۔ یہ تو نہیں کہ ان کی زندگی ہر جہت سے مکمل اور آسودہ رہی ہے، مگر اس ایک زندگی میں اتنی جہتیں جمع ہو گئی ہیں کہ بہر حال ایک متنوع شخصیت پیدا ہوگئی ہے۔ یہ شخصیت نہایت مرکب اور نہایت پیچیدہ ہے۔اس میں علم وعمل، جدید وقدیم ،فطرت وصنعت، مشرق ومغرب ،فنون وعمرانیات کے بہت سارے گوشے جمع ہو گئے ہیں۔حسنِ اتفاق سے اختر اورینوی کی شخصیت میں اقدام و اظہار کے زبردست تقاضے بھی موجود ہیں۔ ان تقاضوں نے صاحبِ شخصیت کو مجبور کیا کہ وہ اپنے ذہن ومزاج کے پیچ وخم دنیا کے سامنے کھول ڈالے۔ چنانچہ اختر اورینوی نے اپنے نفس اور ضمیر کی توضیح وتسکین اور اسی طرح اپنی شخصیت کی ترتیب وتکمیل کے لیے کبھی شاعری، افسانے ، ڈرامے ،تنقید اور ناول کو وسیلہ ؟ اظہار بنایا اور کبھی خارجی اوقات میں تقریر،مختلف تحریکوں کے ساتھ تعاون اور متعدد دوسرے طریقے سے حلِ مسائل کی کوشش کی۔ یہ ساری کوششیں تمام ہیں یا نا تمام، ان سے شخصیت کی جامعیت کا پتہ چلتا ہے یا انتشار کا ان سوالوں کا جواب تو مستقبل ہی دے گا۔اتنی بات یقینی ہے کہ یہ کوششیں ایک صاحبِ بصیرت اور اولو العزم فرد کا پتہ دیتی ہیں۔

(ماہنامہ ساغرِ نو، پٹنہ،ص:۱۰، اختر اورینوی نمبر، ناشر: مکتبہ ادب، پٹنہ، اشاعت:1965ء)

بہر کیف !افسانہ نگاری کی طرح ناول نگاری میں بھی اختر اورینوی کا پایہ کافی بلند ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انہوں نے ادب کے جس میدان کا بھی رخ کیا ہے، اس میں اپنی عظمت و انفرادیت کے ساتھ اپنی فتح وکامرانی کا پرچم بلند کیا ہے۔ " حسرتِ تعمیر " نے ان کو ایک ایک عظیم ناول نگار کی حیثیت سے شہرت ومقبولیت بخشی ہے۔ " حسرتِ تعمیر" حسرت و یاس کے کھنڈر میں تعمیر کردہ اختر اورینوی کا ایک ایسا جیتا جاگتا ناول میں جس میں زندگی کی قوتوں اور اس کے متنوع مسائل کی فنکارانہ تصویر دوڑتی اور چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ناول نگار نے اپنے موئے قلم سے اس میں چند

مسائلِ حیات اور سماج کی ناہمواریوں کی ایسی مصوری کی ہے کہ بس دیکھا کیجیے۔ اختر کا یہ ناول اردو کے چند اہم اور کامیاب ناولوں میں سے ایک ہے، جس میں معاشرتی تغیرات اور سماجی تبدیلیوں کے امکانات و اثرات کو بڑے فنکارانہ اسلوب میں واضح کیا گیا ہے۔ ادب، تہذیب و ثقافت کا عکاس اور سماجی تغیرات کا آئینہ دار ہونے کے ساتھ اپنے وقت کے مطالبات و مقتضیات کا مظہر ہوتا ہے۔ حیات و کائنات کی مسرتیں اور محرومیاں اس میں صاف نظر آتی ہیں۔ "حسرتِ تعمیر" میں یہ وصف موجود ہے۔

اس ناول میں کل ۲۵ / کردار ہیں، جن میں سے کچھ خاص کے نام یہ ہیں: بوس محبوب، میں، منظر، مسرور، بیگم، مجیب، شمشیر الدولہ، مسز شمشیر الدولہ، سلمیٰ سوگیتی، عذرائے شانتی، جمیل انور، مدارن نور باف وغیرہ۔ بوس محبوب اس ناول کا بنیادی کردار ہے، جو ایک کمپاؤنڈر کا بیٹا تھا۔ اس کا باپ کثیر الاولاد تھا، اس لیے وہ اعلیٰ تعلیم نہ پا سکا اور آگے چل کر تجارت کرنے لگا۔ ناول نگار (اختر اورینوی) نے بوس محبوب کی اخلاقی کمزوری، اس کی تعیش پسندی اور خوشامد پسندی کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ وہ قاری کو بتاتے ہیں کہ بوس کروڑوں اربوں کا منصوبہ بناتا ہے، لیکن اس کی ناشائستہ حرکتیں اس کی ترقی کے راستے میں حائل ہو جاتی ہیں۔ ناول کا کلائمکس اور خلاصہ یہ ہے کہ کمزور کو طاقت ور ہمیشہ زیر کر کے غلام بنا لیتا ہے۔ بوس محبوب جو صنعتی انقلاب لانے کا خواب دیکھ رہا تھا، اسے بڑی مچھلیوں نے ہضم کر لیا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے تباہ و برباد ہو گیا۔ ناول نگار آخر میں حسرت بھرے لہجے میں کہتا ہے کہ کیا طاقت کا قانون بدلا نہیں جا سکتا کہ کمزوروں اور غریبوں کے دلوں میں جو "تعمیر کی حسرت" ہے، وہ پوری ہو۔ ناول کا پلاٹ سلجھا ہوا اور شائستہ و سنجیدہ ہے۔ ناول کی کامیابی دراصل اس کے مرکزی قصہ کے کسی نہ کسی بلند نصب العین کی طرف اشارہ کر دینے یا کسی اہم مقصد تک رسائی کی کوشش میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ یقیناً یہ کوشش فنکارانہ سطح پر تخلیقی بصیرتوں اور تخلیقی ذہانتوں کے ساتھ ابھرتی ہے۔

اس ناول میں روس اور چین کے انقلابات اور مسولینی کے زوال کے تذکرے ہیں تو ہندوستان کی تحریک آزادی کی سرگرمیاں بھی موجود ہیں۔ چرخہ اور کھدّر سے پیدا شدہ صورتِ حال پر بحثیں، گاندھی جی کے نظریہ قومی اتحاد، ہندو مسلم فسادات، انگریزوں کی سازشیں، ان کی شاطرانہ چالیں اور ان کا انجام اور تقسیمِ وطن کے سانحات کو ناول کے پلاٹ میں بڑے فنکارانہ احتیاط کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ تمام باتیں ناول کے مرکزی قصے کے اجزائے لاینفک بن گئی ہیں، جن کی وجہ

سے ناول میں عصری لہروں کی آنچ صاف طور پر محسوس کی جاتی ہے۔ چھوٹا ناگپور کی سرزمین سے متعلق یہ ناول انسانی زندگی اور معاشرتی احوال کی پُر اثر تصویر پیش کرتا ہے۔ ناول کے مطالعہ کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار کو اس خطے کے ذرے ذرے سے واقفیت حاصل ہے اور وہ وہاں کے باشندوں کی نفسیات اور ان کے ذہن و مزاج سے پوری طرح آگاہ ہے۔ ناول نگار نے اگر چہ ایک محدود و مخصوص خطہ کی انسانی زندگی اور معاشرتی مسائل کو ناول کا موضوع بنایا ہے، بایں ہمہ اس میں وسعت اور تنوع ہے۔ ناول کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اختر اورینوی نے اس میں شروع سے آخر تک قصے کی دلچسپی کو برقرار رکھا ہے اور کہیں بھی قاری کو اضمحلال، اکتاہٹ یا بوجھل پن کا شکار نہیں ہونے دیا ہے اور یہ بات ان کی فنکاری اور کامیاب ناول نگاری کی واضح دلیل ہے۔ یہ ناول زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے واقعات کی جزئیات پر بھی ان کی گہری نظر کی عکاس کرتا ہے۔ واقعات کا انتخاب، قصے کا ربط، پلاٹ کی مضبوطی، زبان کی سادگی وصفائی، اسلوب کی کشش، اندازِ بیان کی سحر کاری اور مکالموں کی برجستگی، کردار نگاری اور خوب صورت منظر کشی جیسے اوصاف سے یہ ناول پوری طرح مرصع ہے اور ناول نگار کی مہارتِ فن کا غماز ہے۔

"حسرتِ تعمیر" میں ناول کے مذکورہ تمام اجزائے ترکیبی بحسن وخوبی موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس ناول کا شمار اردو کے اہم اور کامیاب ناولوں میں ہوتا ہے۔ یہاں سرِ دست اس کی کردار نگاری، منظر نگاری اور منفرد اسلوب پر گفتگو کی جاتی ہے۔ "حسرتِ تعمیر" کی کردار نگاری پُر اثر، جاذبِ نظر اور شان دار ہے۔ اس میں بوس محبوس کا کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے، جس میں اس کی رودادِ حیات پیش کی گئی ہے۔ لیکن صرف اسی ایک کردار کو پیشِ نظر نہیں رکھا گیا ہے۔ ناول نگار بوس محبوب کی شخصیت کے ساتھ جمیل انور، شمشیر الدولہ، سلمیٰ سوگیتی، منظر اور شانتی وغیرہ کرداروں کو بھی پیش کیا ہے۔ ان میں بعض کرداروں کی کارگزاریاں بہت نمایاں ہیں اور قصے میں دلچسپیوں کا سبب بنے ہیں، بایں ہمہ ناول کے پلاٹ میں بوس محبوب ایک کلیدی کردار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ناول کے قصے کا مرکزی کردار ہے۔ ناول نگار نے پورے ناول میں واقعات کے تسلسل اور فطری بہاؤ کو آخر تک برقرار رکھا ہے اور ضمنی واقعات کے ہجوم میں پلاٹ کو الجھنے نہیں دیا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

"حسرتِ تعمیر" کا پلاٹ الجھا ہوا نہیں ہے۔ اس میں سادگی و پرکاری ہے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کے پہلے سین کی طرح اس کا پہلا باب ہمیں چیدہ کرداروں کی خوبو سمجھا دیتا ہے اور ہمیں ناول کے قماش سے آگاہی ہو جاتی ہے..... بحیثیتِ مجموعی "حسرتِ تعمیر" اردو ناولوں کے ارتقا کے باب میں

ایک سنگِ میل ہے اور اختر اورینوی کو ناول نگاروں کی پہلی صف میں ممتاز جگہ دیتا ہے۔

(معنیٰ کی تلاش، ص:۹۹، ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی)

ناول کے اجزائے ترکیبی میں منظر نگاری کو بڑی اہمیت وفوقیت حاصل ہے۔ منظر نگاری کے بغیر ناول بے رنگ ونور معلوم ہوتا ہے اور اس کی تصویر پھیکی نظر آتی ہے۔ منظر نگاری، ناول کے سادہ خاکوں میں نہ صرف رنگ بھرتی ہے بلکہ اس کے بے جان جسم میں روح پھونکنے کا کام انجام دیتی ہے۔ اختر نگاری کو منظر نگاری میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ ان کی شاعری ہو یا افسانہ وناول نگاری، سب میں ان کا یہ وصف کافی نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کا تخلیقی جوہر منظر نگاری میں اپنا کمالِ فن دکھاتا ہے اور بہ ظاہر معمولی اور غیر دلچسپ واقعہ کو بھی اپنی بے مثال منظر نگاری سے دلچسپ اور پُر تاثیر بنا دیتا ہے۔ ان کے خوب صورت اسلوب اور پُر کشش طرزِ تحریر کی وجہ سے ناول کے مناظر ملک اور معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر بن گئے ہیں۔ چھوٹا ناگپور کے قدرتی مناظر کا بیان انہوں نے اس انداز سے کیا ہے کہ اس کو پڑھ کر کرشن چندر کے ناول "شکست" کے کشمیری مناظر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ موصوف نے چھوٹا ناگپور کی ایسی خوب صورت قلمی تصویر پیش کی ہے کہ قاری خود کو اس ماحول میں گشت کرتا ہوا پاتا ہے۔ بے مثل منظر نگاری، مشاہدے کی گہرائی، تخلیقی اندازِ بیان، پُر کشش اسلوب، فنکارانہ تخیل اور سحر طراز فطرت نگاری کی یہ مثال ملاحظہ کریں اور ناول نگاری کی مہارتِ فن کی داد دیں:

جنوبی بہار کی سطحِ مرتفع کا لامحدود جمال، اس دیار میں سپاٹ پن تو نام کو بھی نہیں۔ نقشہ اور منظر ہر قدم پر بدلتا رہتا ہے۔ نئے خطوط، نئے دائرے، جدید زاویے، نوع در نوع تشیب وفراز، رنگ اور سائے کی نیرنگیاں، افق کا انوکھے سے انوکھا پھیلاؤ، زمین کی تازہ ترین دل نوازیاں اور مہربانیاں، بادل کے کھلاڑی پن سے آسمان پر نت نئی مصوری اور ان سب کی بدعت بداماں ترتیب وتنظیم، تنوع کے امکاناتِ بے پایاں اور لذت کی نوعیتیں بے حساب۔ برسات تو اس علاقے میں جادو کی بانسری بجاتی ہوئی آتی ہے۔ ڈھلوانوں اور ٹیلوں کے کوروں پر سبزہ؟ خوابیدہ جاگ اٹھتا ہے۔ درختوں کا ہر یالا پن سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جنگل اتنے سحر انگیز طور پر جاندار ہو جاتے ہیں کہ اس کی روحانیت پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ نشیبی میدانوں میں دھان کے کھیتوں کے اندر سفید نیل مشک رنگ اور عنبریں عورتیں، یہ سب مل کر مٹی کو سونا بنانے کے حقیقی کیمیا کو عملی شکل دینے میں مشغول نظر آتے ہیں ..... برسات کی راتیں خوابناک ہوتی ہیں، لیکن چھوٹا ناگپور کی شب برشکال اور وہ بھی جب چاند

کے رخِ تاباں سے ابر کا پردہ ہوا سے ہٹا ہوا نیند زاروں کے درمیان چاندنی وہ بہروپ بدلتی ہے کہ سطحِ مرتفع پریوں کا دیس معلوم ہونے لگتا ہے۔ سارا منظر نرم و دل گداز ہو کر سیال سا ہو جاتا ہے اور جولانیِ تخئیل کی نیرنگیوں کے مطابق چولا بدلتا رہتا ہے۔

(حسرتِ تعمیر، ص:52،51، ناشر: بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ)

غرض کہ اختر اورینوی ناول کی تکنیک، اس کے عناصرِ ترکیبی، پلاٹ، قصے، کردار، منظر نگاری اور ناول کے بیانیہ اسلوب سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے مولوی نذیر احمد دہلوی کی ناول نگاری پر جو وقیع مقالہ تحریر کیا ہے اور اس میں فن ناول نگاری کے مالہ و ماعلیہ پر جس محققانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے، اس سے ان کی مہارتِ فن کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ ناول نگاری کے اصول و مبادی پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے ناول سے متعلق اپنے مقالے میں جن اصول و شرائط کا ذکر کیا ہے، ان کو اپنے ناول میں برت کر دکھایا ہے۔ غرض کہ واقعات کے انتخاب، قصے کے ربط، پلاٹ کی مضبوطی، زبان کی سادگی اور صفائی، اندازِ بیان کی بے تکلفی اور مکالموں کی برجستگی نے ان کے ناول کو پُرکشش بنا دیا ہے۔ انہوں نے زندگی کے پھیلاؤ، گہرائی اور اس کے مسائل کو جس رنگ میں پیش کیا ہے اور فن ناول کے عناصر کو برتنے کا جس طرح اہتمام کیا ہے، وہ ان کی تخلیقی بصیرت اور فنی شعور کی خوب صورت مثال ہے۔

☆☆☆

Jogindar Paul : Ek Munfarid Afsana nigar by Mohd. Nurul Hoda
(Research Scholar,dept. of Urdu & Persian GND University,Amritsar)
محمد نورالہدیٰ (ریسرچ اسکالر، نگراں: ڈاکٹر ریحان حسن، گورونانک دیو یونیورسٹی، امرتسر، پنجاب)

جوگندر پال: ایک منفرد افسانہ نگار

اردو افسانے کا ایک دور پریم چند سے شروع ہو کر راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور منٹو پر مکمل ہوتا ہے اور دوسرا دور انتظار حسین، انور سجاد اور رشید امجد سے شروع ہوتا ہے۔ جوگندر پال ان دونوں ادوار کے سنگم پر اپنے پورے تخلیقی وجود کے ساتھ سر بلند کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ پریم، چند سے منٹو تک ترقی پسند اور حقیقت پسند افسانہ نگاروں کے ساتھ ان کے عہد کی تکمیل کرتے دکھائی دیتے ہیں تو وہیں نئے افسانے کے آغاز پر نئے افسانے کے پیش رو کے طور پر اسے بڑھاوا دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ ترقی پسند افسانے اور جدید افسانے دونوں کے ساتھ پورے ادبی وقار کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر اپنے پورے اور اونچے ادبی قد کے ساتھ کھڑا ہونے والا یہ تخلیق کار اردو کی ادبی تاریخ کا بے حد اہم کردار ہے۔ ایسا اہم کردار جسے ابھی اس کا عہد پوری طرح جان نہیں سکا۔ یہ زمانی سنگم کئی تخلیق کاروں نے دیکھا لیکن اس منفرد مقام کو جوگندر پال کے علاوہ کوئی نیا کہانی کار حاصل نہیں کر سکا۔

جوگندر پال کی زندگی کے احوال بھی کسی ناول یا افسانہ سے کم نہیں ہے۔ ان کا تعلیمی سفر، تعلیم کے بعد بے روزگاری، شادی کی دلچسپ روداد، بیرون ملک ملازمت اور پھر جوانی کے ایام میں ہی رٹائرمنٹ پھر ہندوستان واپسی۔ یہ سب کچھ اتنا دلچسپ ہے کہ قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ جب افسانہ نگار کی زندگی کی روداد اتنی دلچسپ ہے تو ان تجربات کو بھٹی میں تپا کر اس نے جو افسانے لکھے ہوں گے وہ کس نوعیت کے ہوں گے؟

ڈاکٹر ابوظہیر ربانی کا ماننا ہے کہ پال کے افسانے سوچے سمجھے پالٹ کے تحت نہیں ہیں بلکہ وہ تمام پابندیوں سے آزاد ہیں۔ انہوں نے پالٹ اور واقعات سے زیادہ زور کرداروں کے ذہنی رویوں کو دیا ہے۔ جوگندر پال کی زیادہ تر کہانیاں علامتی اور تجریدی ہیں۔ لیکن ان کے افسانے قاری

کو اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیتے۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ انہوں نے انہی پہلوؤں کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے جو جس کا انہوں نے خود مشاہدہ کیا ہے۔ جوگندر پال اردو ادبی دنیا میں افسانہ نگار کی حیثیت سے اس وقت مشہور و مقبول ہوئے جب ان کا پہال افسانوی مجموعہ ''دھرتی کا کال'' کے عنوان سے 1961ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ اس مجموعہ کے علاوہ ان کے دیگر افسانوی مجموعوں میں ''میں کیوں سوچوں''، ''رسائی''، ''مٹی کے ادراک''، ''لیکن''، ''بے محاورہ''، ''بے ارادہ''، ''کھال''، ''کھودو بابا کا مقبرہ'' ہیں۔

جوگندر پال اپنے افسانوں کے موضوعات براہ راست زندگی سے اخذ کرتے ہیں اور کرداروں کے مکالموں کے ذریعے اصل مسئلہ کی طرف کچھ اس طرح اشارہ کرتے ہیں کہ وہ قاری کے حافظہ کا حصہ بن جاتا ہے۔ موضوعات کی پیش کش کا یہ طریقہ جوگندر پال کی فکر کی گہرائی اور وسعت کو ظاہر کرتا ہے اور ان کی انفرادیت کا پتہ دیتا ہے۔ وہاب اشرفی ان کی افسانہ نگاری کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"جوگندر پال اپنے افسانوں کے موضوعات کے لیے زندگی کے مسائل کی طرف براہ راست رجوع کرتے ہیں اور ان پر اپنے کرداروں کی زبان سے خاصے تیکھے تبصرے کرواتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا یہ تیور انھیں ایک فکری ساخت دے دیتا ہے اور ان کی انفرادیت نئے لکھنے والوں میں مسلم ہو جاتی ہے۔"

جوگندر پال کی افسانہ نگاری کا ابتدائی زمانہ کینیا، جنوبی افریقہ میں گذرا۔ وہاں وہ ایک طویل عرصہ تک مقیم رہے۔ اس دوران انھوں نے وہاں کے لوگوں کی زندگی اور اس کی پیچیدگیوں کو بہت قریب سے دیکھا اور اس زندگی کے گوناگوں مسائل و مشکالت کو اپنے افسانوں میں سمونے کی کوشش کی۔ اس لیے ان کے ابتدائی افسانے افریقی زندگی اور ماحول کے عکّاس نظر آتے ہیں۔ ان افسانوں میں انھوں نے مشرقی افریقہ کے سیاسی اور سماجی ماحول کی عکّاسی کرتے ہوئے اس سرزمین پر انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ اور انگریزوں کے ذریعے افریقیوں پر ہوئے مظالم و استحصال اور ان کی دکھ بھری زندگی کو موثر انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ جوگندر پال جب جنوبی افریقہ سے مکمل طور پر واپس ہندوستان آئے تو وہ کچھ دنوں حیدرآباد میں رہے۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک اورنگ آباد پھر مکمل طور پر دہلی میں قیام پذیر ہوئے۔ انھوں نے ہندوستان کے چھوٹے بڑے مختلف شہروں کی زیارت کی۔ اس سے انھیں انسانی زندگی کو الگ الگ رنگوں میں دیکھنے کا موقع مال،

ان کے مشاہدہ میں وسعت پیدا ہوئی اور مختلف مسائل وموضوعات نے ان کے افسانوں میں جگہ پائی۔یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کا کینوس وسیع نظر اتا ہے۔

جوگندر پال نے سات دہائیوں سے زیادہ عرصہ پر محیط اپنے افسانوی سفر میں کئی نمائندہ افسانہ ''بُو''، ''رسائی''، ''مہابھارت''، ''کتھا ایک پیپل کی'' وغیرہ قابل قدر افسانہ اردو ادب کو دیے جن میں دیکھایا گیا ہے کہ سرکاری اسپتالوں میں کیسے نااہل ڈاکٹرز کر ہیں۔''بُو'' میں اس حقیقت سے بھی پردہ اُٹھا کہ عوام کے عالج ومعالجہ کی خدمات پر مامور کیے جاتے ہیں جن کی ساری توّجہ رشوت خوری اور کالے دھن کی کمائی پر ہوتی ہے۔ یہ نااہل ڈاکٹر اسپتال کی دوائی سے لے کر اوزار تک بیچ ڈالتے ہیں اور اپنی کمائی کے لیے عام انسانی زندگی کے ساتھ بھی کھیلواڑ کرتے ہیں۔جب زندہ انسانوں سے ان کی ہوس پوری نہیں ہوتی ہے تو اسپتال میں پڑی لاشوں کو بھی فروخت کرنے کا کاروبار کرنے لگتے ہیں۔افسانہ کا مرکزی کردار ڈاکٹر سروپ ہے جو سرکاری اسپتال کا ایک نااہل ڈاکٹر ہے۔اسے رشوت کھانے اور کالے دھن کمانے میں بڑی مہارت ہے۔اسے شراب کی زبردست لت لگی ہوئی ہے۔ انسانی واخلاقی اقدار اس کے لیے بے معنی ہیں۔اسے اپنی بیوی بچوں سے بھی محّبت وہمدردی نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کی پیاس ان سے بھی زندہ نہیں ہوتی۔اس کی بیوی اس سے کہتی ہے۔

''ارے اوسرو، تمہارے بیوی ہے، پھول سی بچی ہے ہم سے تمہاری پیاس زندہ کیوں نہیں ہوتی؟'' پھر ناری کو یکلخت اپنی بے بسی پر غصہ انے لگتا ہے۔''تم۔۔۔۔تم مُردوں کے ڈاکٹر ہو سرو، تم کیا جانو، کسی بے کل روح کی بچی کھچی سانسیں اکٹھی کر کے اسے اپنے پیروں پر کیسے کھڑا کیا جاسکتا ہے؟ اس اقتباس میں جوگندر پال نے نااہل اور بے ضمیر ڈاکٹر کی بے حسی پر بڑا گہرا طنز کیا ہے۔اس افسانہ میں انھوں نے عصر حاضر کے انسان کی بے ضمیری پر ماتم کرتے ہوئے، سماج میں معدوم ہوتی ہوئی انسانیت کے المیہ کو فن کارانہ مہارت سے'' رسائی'' میں آجاگر کیا ہے۔

جوگندر پال نے رشوت خوری، منافقت، ریاکاری اور چور بازاری جیسے مسائل کو بے نقاب کیا ہے۔افسانہ کا مرکزی کردار رام پرشاد ہے جو بظاہر بڑا اچھا جیوتشی ہے مگر دراصل ایک جیوتشی کے بھیس میں وہ نشیلی اشیاء کی سوداگری کرتا ہے اور بہت سارے ممالک کا جاسوس ہے۔اپنے اسی دھندے کی خاطر اس نے جیوتش کا پیشہ اختیار کیا ہوا ہے۔" کتھا ایک پیپل کی" میں سماجی ناہمواری، طبقاتی نابرابری اور نچلے اور پست طبقے پر ہورہے ظلم وستم کی پُر اثر داستان بیان کی ہے۔جوگندر پال نے اپنے بعض افسانوں میں شہری زندگی کے بہت اچھے نقوش کھینچے ہیں۔''سواریاں''اور''بازدید'' کا

شمار ان کے ایسے ہی افسانوں میں ہوتا ہے جن میں شہر کی ہنگامہ خیزی، مشینی زندگی اور اس کی مشکالت ومسائل کو دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ وزیر آغا ان کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''جوگندر پال ان ادیبوں میں سے ایک ہیں جن کی تحریروں میں سوچ کا عنصر روشنی کی درخشندہ گزرگاہوں کی طرح صاف نظر اتا ہے۔ ان کی فکر شبنم کی طرح شفاف اور خوشبو کی طرح تازہ ہے۔ یہ کسی فلسفے یا نقطۂ نظر سے ماخوذ یا اس کی تشہیر کا وسیلہ نہیں بلکہ اس کے بیحسی تجربات سے پھوٹی ہے۔ اور اسی لئے بے حد دلکش اور منفرد لگتی ہے۔ پروفیسر قمر رئیس، جوگندر پال کی انفرادیت پر یوں روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"فن کے معاملے میں جوگندر پال نے اس کی ریاضتی تعریف کو قابل اعتنا نہیں سمجھا اور انہوں نے اپنے تخلیقی شعور اور جمالیاتی وجدان پر زیادہ بھروسہ کیا اور اپنے مواد کو تخلیقی اظہار کی ایسی سطح سے پیش کیا کہ افسانہ کی روح سے تعرض کئے بغیر اس کی ایک الگ شناخت بن گئی ہے۔ افسانہ ہو یا ناول جوگندر پال کی ہر نئی تخلیق ایک نئی واردات، نئے تجربے کا مظہر ہوتی ہے۔ ان تخلیقات میں جو شئے مشترک ہوتی وہ ہے مصنف کی دردمندی، عصری مسائل کا ادراک اور عام انسان کے دکھ درد سے گہری وابستگی۔ وہ زندگی کے عام اور معمولی واقعات میں اسانی سے دوررس نفسیاتی اور تہذیبی حقائق کا مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ ان کا وژن افاقی ہے اور ان کے بیشتر افسانے ایک نئی جمالیاتی حیشیت کا احساس دالتے ہیں جس سے ان کے فن کی منفرد شناخت قائم ہوتی ہے۔"

جوگندر پال کے افسانوں کے جائزے سے احساس ہوتا ہے کہ ان کے افسانوں میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھے افسانہ نگار کے لیے لازمی ہیں۔ وہ کردار، واقعہ، قصہ پن اور پس منظر کے لوازم کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ پالٹ کی تشکیل میں وہ ایک خاص معیار قائم رکھتے ہیں۔ وہ واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ افسانہ پڑھتے وقت قاری کو اپنی طرف راغب کرتا ہے۔ کردار نگاری میں بھی ان کا فنّی شعور عروج پر ہے۔ وہ کردار کی داخلی وخارجی دونوں خصوصیات کو اُجاگر کرتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں ایک تخلیقی دنیا کو پیش کرتے ہیں فرضی واقعات کی مدد سے ایک ایسی صورت حال ابھرتے ہیں کہ ان کی تصویر حقیقی نظر آتی ہے۔ زبان وبیان کے لحاظ سے بھی ان کے افسانے دلکش اور جاذب توجہ ہیں۔ غرض یہ کہ انھوں نے اُردو افسانہ نگاری کے میدان میں اپنی فکری وفنّی مہارت اور اپنے فن کارانہ کمال کا ایسا مظاہرہ کیا ہے کہ ان کا شمار اپنے عہد کے بلند پایہ

افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کا مطالعہ کرتے ہوئے، م۔م۔ راجندر نے بڑی دلچسپ رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے جوگندر پال بالشبہ اپنے عہد کے ایک ایسے جیالے اور پختہ کار افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اپنی لازوال تخلیقات سے اردو افسانے اور ادب کو ملا مال کیا ہے۔

حوالے:

پروفیسر قمر رئیس،، جوگندر پال، افسانہ، بو، مشمولہ، نمائندہ اُردو افسانے، اُردو اکادمی دہلی، 2014ء، ص:180۔

2۔ وزیر اغا، جوگندر پال کا فن، مشمولہ، جوگندر پال، ذکر، فکر، فن، ص:44۔

3. پروفیسر قمر رئیس، جوگندر پال کا فنی اسلوب، مشمولہ، آج کل،) جوگندر پال نمبر (،نئی دہلی، جنوری، 1997ء، ص:28۔

4. ادب، پنجاب، گوشہ جوگندر پال، م۔م۔ راجندر، جوگندر پال۔ ایک مطالعہ، مشمولہ، ماہنامہ پرواز جلد، 16 شمارہ:12۔9 ستمبر، دسمبر، 1994ء، ص:149۔

☆☆☆

Aligarh Tahreek aur Urdu Adab by Ayesha Nasreen K.P.(Govt. College Mallappuram, Kerala

عائشہ نسرین کے۔پی (گورنمنٹ کالج ملاپرم' کیرالا)

علی گڑھ تحریک اور اردو ادب

علی گڑھ تحریک اردو ادب کی ایک مقبول اور فعال تحریک تھی اور اردو کی دیگر ادبی تحریکوں کے مقابلے میں اس کے بڑے دیر پا نتائج برآمد ہوئے۔ چونکہ اس کا مرکز علی گڑھ تھا اس لیے علی گڑھ تحریک کے نام سے مشہور ہوئی اور سرسید احمد خان اس کے سب سے بڑے علمبردار اور محرک تھے۔اس لیے اسے سرسید تحریک کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ 1857ء کی جنگ آزادی اس تحریک کا نقطہ آغاز ہے۔ یہی وہ سال ہے جب کہ ہندوستانیوں نے انگریزوں کے مجرمانہ عہد اقتدار کے خلاف بغاوت کی تھی جو ناکام رہی اور اسی سال سلطنت مغلیہ کا اختتام ہوا۔علی گڑھ تحریک کا دوسرا اہم اور مثبت پہلو یہ ہے کہ انگریزوں کے دور اقتدار میں ہندوستان میں کئی سماجی معاشرتی اور ادبی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔سرسید احمد خان اپنی قوم کو جہالت کی پستی اور تنگ نظری کے اندھیرے سے نکال کر اعلیٰ تعلیم کے اجالے میں لانا چاہتے تھے ان میں بلند خیالی اور وسعت نظر پیدا کرنا چاہتے تھے۔وہ ہندوستانیوں کو پہلے ذہنی طور پر انگریزوں سے مقابلے کے لیے تیار کرنا چاہتے تھے اور ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مغربی علوم وفنون سے اپنی قوم کو بہرہ مند کرنا چاہتے تھے۔مغربی علوم وفنون اور انگریزی ادبیات سے اثر پذیری کے نتیجے میں نہ صرف اردو شعر وادب میں تبدیلیاں آئیں بلکہ متعدد نئی اصناف بھی وجود میں آئیں۔

علی گڑھ تحریک کی مختلف النوع خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس تحریک نے اردو شعر وادب پر بڑے گہرے اور دیر پا اثرات مرتب کیے۔خصوصاً اردو ادب کو مغربی علوم وفنون سے فیض یاب کرنے میں علی گڑھ تحریک نے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں ہیں۔سر سید احمد خان اور ان کے رفقا الطاف حسین حالی، نذیر احمد، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد، وقار الملک، محسن الملک، اور چراغ علی اس تحریک کے ممتاز اراکین تھے۔ بعد کو اس عظیم الشان تحریک سے وابستہ

ہونے والے شعرا اور ادیبوں میں وحید الدین سلیم، نواب عماد الملک، عبد الحلیم شرر، نواب صدر یار جنگ، ڈاکٹر ضیاء الدین، آفتاب احمد خان، مولوی عبد الحق، طفیل احمد، ظفر علی خان، سجاد یلدرم، عزیز مرزا، عنایت اللہ، حسرت موہانی، رشید احمد صدیقی، عبد الماجد دریا بادی، ڈاکٹر عابد حسین، غلام السیدین، ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر محمد مجیب قابل ذکر ہیں۔

جہاں تک اردو ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات کا تعلق ہے، فورٹ ولیم کالج کی کوششوں اور مکاتیب غالب کی مقبولیت کے باوجود اردو نثر ابھی تک فارسی زبان وادب کے رجحانات سے بے حد متاثر تھی۔ عام بول چال کی سیدھی سادی زبان تحریر میں استعمال نہیں ہوتی تھی۔ انگریزی زبان کے زیر اثر سرسید اور ان کے رفقا نے عام بول چال کی زبان کو تحریر میں استعمال کرنے کی کامیاب تحریک چلائی۔ اس تحریک کا مقصد عبارت آرائی سے گریز کرتے ہوئے اپنے مشاہدات، تجربات، اور خیالات کو سیدھے سادے اور عام فہم لیکن موثر انداز میں پیش کرنا تھا۔ دوسرے الفاظ میں خیال کو بنیادی اہمیت دی گئی اور زبان و بیان کی خوبیوں کو ثانوی۔ سرسید کے نزدیک تخلیق ادب بیکاری کا مشغلہ نہیں بلکہ یہ زندگی اور سماج کو سنوارنے، سدھارنے اور بہتر بنانے کا سب سے اچھا ذریعہ ہے۔ اردو زبان وادب میں اب تک علمی اور فلسفیانہ مسائل کی گنجائش پیدا نہیں ہوئی تھی۔ قومی اصلاح اور مسلمانوں کو ذہنی پستی سے نکالنے کے لیے ضروری تھا کہ اردو میں اچھا ادب پیدا ہو۔ شاعری اور تنقید کے اصول مرتب ہوں۔ علی گڑھ تحریک نے اس سلسلے میں اہم کارنامے انجام دیے۔

سرسید کے خیال میں ادب میں زندگی کے مسائل اس طرح ترجمانی ہونی چاہئے کہ اس سے زندگی اور معاشرے کو فائدہ پہنچے۔ اس طرح وہ ادب کے افادی پہلو کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں۔ سرسید بنیادی طور پر ایک سماجی مصلح تھے۔ اس مقصد کی تبلیغ و تلقین کے لیے فطری طور پر انہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں اردو زبان کا استعمال کیا اور اس طرح اردو زبان بالواسطہ طریقے پر سرسید کی عظیم الشان سماجی تحریک سے وابستہ ہوگئی۔ چونکہ سرسید کا اسلوب پر اثر تھا اس لیے نہ صرف ان کے ہم نوا بلکہ مخالفین بھی جو ان کی مخالفت میں اخبار اور رسالے نکالتے تھے، نادانستہ طور پر سرسید کی زبان اور ان کے اسلوب کی پیروی کرتے تھے۔ اس طرح انقلاب کی اس جدوجہد میں اردو نثر کا سادہ اور موثر اسلوب خود بخود اردو لکھنے والوں میں رواج پا گیا۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ نے بالکل درست لکھا ہے:

"سرسید اور ان کی جماعت کے لوگوں نے اردو کو جو عملی اعتبار سے اس وقت تک ایک بے مایہ زبان تھی، تھوڑے عرصے میں اعلیٰ علمی جواہر ریزوں سے مالا مال کر دیا" سرسید اور ان کے نامور رفقا۔ صفحہ 58

علی گڑھ تحریک کی وسعی وکوشش سے انگریزی زبان وادب کے زیر اثر متعدد اصنافِ ادب جیسے ناول ،مختصر افسانہ، تنقید، انشائیہ، سوانح عمری وغیرہ اردو میں رائج ہوئے۔سرسید نے انگریزی کے مشہور ادیبوں جوزف ایڈیسن اور رچرڈ اسٹیل کی تقلید میں اپنے رسالے تہذیب لاخلاق میں مختلف سماجی، اخلاقی، علمی، دینی اور سیاسی مسائل پر خود بھی مضامین لکھے اور اپنے رفقا سے بھی لکھوائے۔اس طرح مختصر مضمون اور انشائیے صنف اردو میں رواج پانے لگی۔ان مضامین کی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں ایک طرف سائنٹفک انداز اور عقلیت پسندی پر زور دیا جاتا تو دوسری طرف غیر ضروری لفاظی اور عبارت آرائی سے گریز کیا جاتا تھا۔اسلوب بیان کی سادگی اور تاثر کی فراوانی اس تحریک کی بنیادی خوصوصیت تھی۔غرض علی گڑھ تحریک ایک عظیمالشان اصلاحی، علمی، اور ادبی تحریک تھی جس کے بڑے دوررس اور دیر پا نتائج سامنے آئے۔بقول پروفیسر نورالحسن نقوی:

''ہماری زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو سرسید اور علی گڑھ تحریک کے احساں سے گراں بار نہ ہو۔اس تحریک نے عملوں کو جدوجہد عمل کا درس دیا، ماضی کے پرستاروں کو حال کی اہمیت سے آشنا کیا۔تنگ نظروں کو وسعت نظر سکھائی، بزرگوں کے کارناموں پر فخر کرنے والوں کو اپنی ذات میں خوبیاں پیدا کرنے پر آمادہ کیا، مشرق کے پجاریوں کو مغرب کے کارناموں سے آشنا کیا، دنیا کو بے حقیقت بتانے والوں کو دنیا میں نیکی کمانے اور آخرت کے لیے توشہ جمع کرنے کا راستہ دکھایا، اس عظیم الشان تحریک نے سوتوں کو جگایا اور مردوں میں جان ڈالی۔مختصر یہ کہ علی گڑھ تحریک نے ہندوستانی مسلمانوں کو زندہ قوموں کی طرح زندگی گزارنے اور سربلند ہوکر جینے کا سلیقہ سکھایا۔''

(پروفیسر نورالحسن نقوی۔ادیب (سہ ماہی) 1993 ص 231

ہندوستان کی سیاسی اور تمدنی تحریکوں میں یہ امتیاز علی گڑھ تحریک کو ہی حاصل ہے کہ اس کے نشوونما کا مطالعہ نہ صرف تاریخ وعمرانیات کے طالب علم کے لیے دلچسپی کا باعث ہے بلکہ شعروادب کے متوالوں کے لیے بھی اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے۔سرسید اور ان کے رفقاء جہاں اپنے دل میں قومی درد اور تہذیبی ومعاشرتی زندگی میں انقلاب لانے اور اسے عصر جدید کے امکانات سے ہم آہنگ کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے وہاں ان کے ذہن تخلیقی جوہر سے بھی مالا مال تھے۔وہ عمل کی تلوار سے بھی آشنا تھے اور قلم کے جادو سے بھی۔علی گڑھ تحریک کی بدولت اردو شعروادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے جسے نشاۃ الثانیہ سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔علی گڑھ تحریک اردو زبان میں مقصدی ادب کی پہلی آواز ہے اور اردو نظم ونثر کی تمام اصناف واسالیب کے امکانات کا ازسرنو جائزہ

لے کر اسے قومی زندگی اور اقدار عالیہ کا ترجمان بنانے کی پہلی جدوجہد ہے۔سرسید اور ان کے تمام رفقاء کے تصنیفی کاموں کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ حالی، شبلی، نذیر احمد، ذکاءاللہ، محسن الملک، اور چراغ علی کی بدولت اردو زبان میں تاریخ، سیاست، مذہب، فلسفہ، علم کلام، سائنس، سوانح، سفر نامہ، مقالات، تراجم، خطبات، انشائیہ، مکاتیب، افسانہ، نظم نگاری، ادبی تنقید اور تبصرہ نگاری کا جو سرمایہ فراہم ہوا وہ اپنے مواد، اسالیب اور نقطہ نظر کے اعتبار سے ہمارے علمی اور ادبی خزانے میں اپنی نوعیت کا نیا اور منفرد اضافہ ہے۔علی گڑھ تحریک نے ادب کے چھوٹے چھوٹے چشموں کو ایک وسیع دریا کی شکل میں تبدیل کر دیا اور اردو نظم ونثر کے ہر مدرسہ فکر کو ایک مرکز پر لا کھڑا کیا۔سرسید نے علی گڑھ تحریک کے ساتھ ایک ایسی علمی فضا پیدا کر دی تھی کہ وہ لوگ بھی قلم اٹھانے پر آمادہ ہو گئے جو اپنی افتادِ طبع کے اعتبار سے تصنیف وتالیف پر زیادہ توجہ دینا چاہتے تھے۔

علی گڑھ تحریک صرف سیاسی، سماجی اور تعلیمی تحریک ہی نہیں بلکہ ایک ادبی تحریک بھی تھی جو اردو ادب کی پہلی منظّم اور مبسوط تحریک کہی جا سکتی ہے۔اس تحریک کے ذریعہ اردو ادب میں ایک انقلاب رونما ہوا اور اردو شعر وادب کو موضوع اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے متاثر کیا۔اس تحریک سے اردو شاعری جھوٹ اور مبالغہ آرائی سے پاک ہوگئی اور نثر میں سائنس، فلسفہ، مذہبیات، سیاسیات، تواریخ، سوانح اور تنقید کے موضوعات پر بیش بہا اضافہ ہوا۔سرسید اور ان کی رفقا کے ذریعہ پہلی مرتبہ شعر وادب میں مقصدی ادب کی روایت قائم ہوئی۔علی گڑھ تحریک کے دوسرے پہلوؤں سے اختلاف تو ہوسکتا ہے مگر ادبی نقطۂ نظر سے علی گڑھ تحریک کے سارے پھل میٹھے تھے۔سرسید کے رفقاء میں سے بعض سرسید کے مذہبی معتقدات سے متفق نہ تھے اور بعض دوسرے مسائل میں بھی جزوی اختلاف رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود علم وادب، تصنیف وتالیف اور نظم وانشا پردازی میں سرسید جو نئی روح پھونکنا چاہتے تھے اور جس طرح کی بنیادی تبدیلیوں کے خواہاں تھے ان کا ازکم وبیش سب نے لیا۔سرسید نے اردو ادب کو جو ذہن دیا اس کے عناصر ترکیبی کی اگر فہرست تیار کی جائے تو اس کے بڑے بڑے عنوان مادّیت، عقلیت، اجتماعیت، اور حقائق نگاری وغیرہ ہوں گے۔سرسید کے مجموعی فکر وادب کی عمارت انہی بنیادوں پر قائم ہے اور شاید یہی وہ نمایاں اور اہم رجحانات ہیں جو اردو ادبیات میں سرسید کا فیض خاص سمجھے جاتے ہیں۔ان رجحانات سے اردو کا سارا ادب ان کے زمانے میں متاثر ہوا اور ایک معمولی ردعمل سے قطع نظر آج کا مجموعی ادبی اور فکری رجحان اسی سلسلۂ فکر وعمل کی ارتقائی شکل ہے۔چنانچہ جدید ترین زمانے کی ترقی پسند تاریخ اپنی بیشتر خصوصیات کے لحاظ

سے سرسید کی مادّیت، عقلیت، اور حقائق نگاری ہی کی ہم جنس اور اس کی ترقی یافتہ صورت معلوم ہوتی ہے۔ سرسید نے اپنی تصانیف کے ذریعے اپنے زمانے کے مصنفوں اور ادیبوں کو بہت سے خیالات دیے۔ ان کے ان فکری اور تنقیدی خیالات سے ان کا دور خاصا متاثر ہوا، ان سے ان کے رفقائے خاص ہی اثر پذیر نہیں ہوئے بلکہ وہ لوگ بھی متاثر ہوئے جو ان کے دائرے سے باہر بلکہ ان کے مخالف تھے۔ ان کی تحریر کے خلاف ردعمل بھی ہوا مگر یہ بھی سرسید کی فکری لہر کے سلسلۂ عمل کا فکری نتیجہ ہی تھا اس لیے یہ بھی انہی کے حساب میں درج ہونا چاہیے۔ خالص ادب اور عام تصانیف دونوں زمانے میں ان سے کچھ سیکھا اور بڑی بات یہ ہے کہ ادب میں جو کہنگی اور فرسودہ اور تعطل، جمود اور رخاپن آ گیا تھا اس کو سرسید کی زبردست تصنیفی سرگرمیوں نے بالکل دور کر دیا۔

سرسید نے ادب میں ایک نیا پن، ایک ہمہ گیری، ایک مقصد، ایک سنجیدگی، ایک خاص قسم کی معقولیت پیدا کی جس کے سبب اب ادب کو کوئی بے کاروں کا مشغلہ نہ کہہ سکتا تھا۔ انھوں نے ادب اور زندگی ہی کو باہم پیوند نہیں دیا بلکہ ادب اور اجتماع کے درمیان رشتہ قائم کیا اور ادبیانہ ذہن وفکر کی کاوشوں کو جمہوری کی خدمت پر لا گیا۔ انھوں نے یہ بتایا اور اپنے عمل سے یہ ثابت کیا کہ ادب صرف فرد کے دل کی سچی آواز ہی نہیں جمہور، اجتماع اور قوم کے دل کی سچائی اور ایسی سچی آواز ہے جو اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے بلکہ جمہور کی اصلاح وترقی اور تکمیل کے لیے اٹھائی جاتی ہے۔ ان ادبی نظریات میں سرسید کے رفقائے خاص ان سے اکثر باتوں میں ہم خیال اور ہم قدم ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے بتایا جا چکا ہے کہ شبلی، حالی، نذیر احمد، ذکاء اللہ، چراغ علی، محسن الملک ان کے ہم کار اور رفیق سفر تھے۔ ان کی تحریروں میں سرسید کے افکار وخیالات کے نقوش قدرتی طور سے زیادہ ہیں اور ان میں سے اکثر کے یہاں مزاج اور فکری انفرادیت بھی ملتی ہے۔ اردو ادب کے ان جلیل القدر رہنماؤں کے نقش قدم پر چلنے والے بے شمار مصنفوں اور ادیبوں کے یہاں سرسید کے مکتب فکر کے واضح اثرات مل جاتے ہیں، جن کے اجتماعی عمل کو آسانی کی خاطر علی گڑھ تحریک کے نام سے یاد کر سکتے ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالی دبستان سرسید کے ایک اہم فرد تھے۔ ان کی نثر میں بنیادی طور پر وہ سب خصوصیات ملتی ہیں جو سرسید سے مخصوص ہیں۔ لیکن سرسید اور حالی کی طرز نگارش میں یکسانیت نہیں ہے۔ کیونکہ سرسید کے مضامین میں منطقیت غالب ہوتی ہے، حالی کے یہاں منطق تو ہوتی ہے لیکن بہت کم۔ حالی کے طرز تحریر کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی سادگی اور سلاست ہے۔ انہوں نے زمانے سے انحراف کر کے فطری سادگی اور اسلوب کی روانی پر زور دیا ہے جس سے زبان میں

سلاست اور شائستگی پیدا ہوگئی ہے۔ حالی ہی کے ذریعے اردو نثر نے ایک نیا موڑ لیا۔ ان کی تصانیف "حیات سعدی"، "یادگارِ غالب"، اور "حیات جاوید"، اردو سوانح نگاری میں اولیت کا درجہ رکھتی ہیں۔ حالی نے اردو شاعری بالخصوص غزل گوئی کے روایتی کو تنقید کے ذریعہ جدید طرز سے ہم کنار کیا اس لئے ان کی تصنیف "مقدمہ شعر و شاعری" اردو تنقید میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ کتاب نقادوں کی نظر میں اردو کی بوطیقا میں شمار ہوتی ہے۔ اب تک تنقید نگاری میں مقدمہ سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے۔ انہوں نے 1897 میں "مسدس مدوجزر اسلام" لکھا۔ ان کا یہ مسدس اردو شاعری کا شاہکار ہے۔ انہوں نے اس مسدس کے ذریعہ قوم کی بیداری کا پیغام اس حلقے تک پہنچایا جہاں علی گڑھ کالج یا کانفرنس کی رسائی نہ تھی۔ حالی سرسید کی مذہبی خدمات کی بڑی قدر کرتے تھے مگر وہ سرسید کے مذہبی خیالات سے پورا پورا اتفاق نہیں کرتے تھے۔ مولانا حالی کو چالیس سال تک جس چیز نے علی گڑھ سے وابستہ رکھا وہ علی گڑھ کی تعلیمی تحریک تھی جو مسلمانوں کے لیے ضروری تھی۔

اردو ادب میں افادیت کا احساس محمد حسین آزاد کی "آب حیات" اور مولانا الطاف حسین حالی کے "مقدمہ شعر و شاعری" سے ہوتا ہے۔ محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی نے کرنل ہالرائڈ کی ایماء سے 1874 میں انجمن پنجاب کے جلسوں میں ایسی نظمیں لکھیں جو اب تک اردو شاعری میں مفقود تھیں۔ اردو شاعری میں حب الوطنی کا جذبہ اسی زمانے میں پیدا ہوا۔ آزاد نے قدیم تذکرہ نگاری اور جدید تاریخ ادب اردو کی درمیانی راہ نکالی۔

سرسید جس دینی فکر کی بنیاد رکھی اس کی ترقی میں شبلی، چراغ علی، نذیر احمد اور محسن الملک نے برابر کا حصہ لیا۔ ان سب بزرگوں نے اہم تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ یہ سب سرسید کے علم الکلام سے اثر پذیر ہوئے۔ ان میں سرسید کے افکار سے قریب ترین چراغ علی تھے۔ لیکن ان کی اکثر کتابیں انگریزی میں ہیں۔ وہ عربی کے علاوہ عبرانی اور سریانی زبان سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ اس کی بدولت ان میں تحقیق، وسعت نظر اور علمی جستجو آثار زیادہ ملتے ہیں۔ لسانیاتی مطالعہ کا یہ ذوق بھی دراصل سرسید ہی کا پروردہ ہے۔ اردو میں چراغ علی کے کچھ رسالے موجود ہیں مثلاً تعلیقات، اسلام کی دنیوی برکتیں، قدیم قوموں کی تاریخ، بی بی ہاجرہ، ماریہ قبطیہ، تعلیق نیاز نامہ، وغیرہ۔ تہذیب لاخلاق کے مضمون نگار کی حیثیت سے بھی چراغ علی اردو کے مصنفوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ چراغ علی کا نقطہ نظر سرسید سے کہیں زیادہ عقلی اور تمدنی ہے۔ وہ سرسید کے ان پر جوش حامیوں میں سے ہیں جو اخلاقی مسائل میں اپنے پیشوا سے بھی زیادہ انتہا پسند ہو جایا کرتے ہیں۔ وہ سرسید

کے حقیقی مقلد تھے۔ چراغ علی کے مضامین میں مذہبی زندگی کا اثر بہت گہرا ہے۔ان کی ایک مشہور اردو تصنیف "اعظم الکلام فی ارتقائے اسلام" ہے۔انہوں نے اسلوب بیان میں سلاست اور روانی کا دریا ضرور بہایا لیکن ان کو موضوع کے اعتبار سے عربی کے اکثر الفاظ وتراکیب استعمال کرنے پڑے ہیں جس سے طرز تحریر سریع الفہم اور سادہ تو ہے مگر تحریروں میں شادابی اور شگفتگی کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ چراغ علی کے بعد سرسید کے سب سے بڑے ہم فکر نواب محسن الملک تھے جنھیں سرسید محبّ ومحبوب کے پیارے لقب سے ممتاز کرتے ہیں اور ان سے اس درجہ محبت کرتے ہیں کہ "لحمک لحمی" اور "دمک دمی" کی تلمیحات کے ذریعے اپنی قربت اور قرابت کا اظہار کرتے ہیں۔محسن الملک نے نہ صرف سیاسی امور میں بلکہ علمی کاموں میں بھی سرسید کی بہت مدد کی۔ وہ سائنٹفک سوسائٹی کی سرگرمیوں میں حصہ لیا، خطبات احمدیہ کی تالیف میں ہاتھ بٹایا اور تہذیب لاخلاق میں سرسید کے بعد شاید سب سے زیادہ مضامین انہوں نے ہی لکھے۔محسن الملک نے سرسید کی اصلاحی تحریک کے فروغ کے لیے بہت جدوجہد کرتے تھے۔وہ تہذیب لاخلاق کے مقالہ نگاروں میں صف اول کے صاحب مقالہ نگار شمار کئے جاتے ہیں۔وہ سرسید کے افکار وخیالات کے مقلد اور مفسر تھے۔وہ تعلیمی اعتبار سے بھی سرسید کے ہم خیال تھے اور قدیم درسگاہوں میں روایتی تعلیم کے بجائے جدید تعلیم کے خواہاں تھے۔غرض یہ کہ سرسید کے عقلی افکار کے اثرات قبول کرنے والوں میں محسن الملک کو اولین مقام حاصل ہے نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی کہ اگر سرسید کو اس عقلی تحریک کا دل کہا جائے تو محسن الملک کو یقیناً اس کی "زبان" اور "دماغ" کا درجہ حاصل ہونا چاہیے۔انہوں نے سرسید کی عقلیت میں توازن پیدا کیا اور اس تحریک کو ایک ایسا ذہن عطا کیا جو قومی اور ملکی مزاج کے لیے قابل قبول اور تہذیبی روایات کے عین مطابق تھا۔ انھوں نے سرسید سے اختلاف بھی کیا جس کے ذریعہ انھوں نے وجدان کا اقرار واثبات کیا ہے اور اس طرح ایک ایسی معقول "عقلیت" کا راستہ صاف کیا جس کو آنے والے مصنفین اور ادبا اپنے افکار میں بہ آسانی جذب کرسکیں۔مذہب میں سرسید سے متاثر گروہ میں نذیر احمد اور شبلی بھی شامل ہیں مگر اصولاً ان بزرگوں کو اس رجحان کا نمائندہ کہنا چاہیے جس کا اظہار محسن الملک کی عقل پسندانہ تحریروں میں ہوا۔

ڈپٹی نذیر احمد براہ راست سرسید تحریک سے اثر پذیر نہیں ہوئے۔انہوں نے قرآن مجید اور قانونی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے اس کے علاوہ انہوں نے بے شمار ناول لکھے ہیں۔وہ اپنی ناول نگاری کے ذریعہ اردو ادب کے گلستان کی آبیاری کرتے رہے جس سے قصہ کہانی کے دائرے سے نکل کر

ناول کا روپ اختیار کرلیا۔انہوں نے ناول کے ذریعے تہذیب اور طرز معاشرت کی اصلاح کا کام انجام دیا۔ان کے مشہور ناول" ابن الوقت"،"مراۃ العروس"،" توبتہ النصوح"،" بنات النفس" اور " فسانہ مبتلا" وغیرہ ہیں۔ان کی تحریروں میں وہ روح کار بند ہے جو رفقائے سرسید کے ساتھ مخصوص ہیں۔انہوں نے اخلاقیات،تعلیم نسواں اور قوانین فطرت کی پیروی وغیرہ موضوعات کو اپنایا۔اس طرح وہ سرسید کے بہت قریب ہوگئی۔وہ سرسید کے خیالات سے عموماً متفق معلوم ہوتے ہیں مثلاً تقدیر،توکل،خیروشر، جہاد وغیرہ کے متعلق ان کے خیالات تقریباً وہی ہیں جو سرسید کے ہیں۔وہ ترقی کے تصور کے بڑے مبلغ، مذہب اور فطرت کے مطابق ہونے کے ویّد،ترک دنیا کے مخالف اور عقل کی اہمیت کے قائل ہیں مگر ان کی تحریروں میں اعتدال اور مصلحت اندیشی کے نشانات پائے جاتے ہیں۔

رفقائے سرسید میں ایک شخص ایسا بھی ہے جو سرسید سے متاثر ہونے کے باوجود ان کے بعض تصورات کا سب سے بڑا باغی بھی ہے۔وہ شخص شبلی نعمانی ہے۔مولانا شبلی نعمانی کا سرسید کے رفیقوں میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔وہ بیک وقت عالم،مفکر،ادیب اور شاعر سبھی کچھ معلوم ہوتے ہیں۔انہوں نے اردو ادب میں تاریخ،سوانح عمری اور ادبی تاریخ وتنقید کے ذریعہ بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ان کی مشہور سوانحی تصانیف الفاروق،المامون،سیرۃ النعماں، الغزالیا اور مولانا روم وغیرہ ہیں۔ان کی تصنیف" موازنہ انیس ودبیر" اردو تنقید کی پہلی تقابلی کتاب ہے۔تاریخ ادب میں" شعر العجم" کو خاص مرتبہ حاصل ہے۔ان کی ایک نثری یادگار" سیرۃ النبی" ہے۔شبلی سرسید کی ادبی تحریک سے متاثر ضرور تھے لیکن ان کی تقلید نہیں کرتے تھے وہ ادب کو قدیم اور جدید کا سنگم بنانا چاہتے تھے۔انہوں نے اپنے ایک مضمون" مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم "میں قدیم طرز تعلیم کی حمایت کی ہے اور جدید بنیادوں پر اس کو استوار کرنے پر زور دیا۔شبلی کا اسلوب بیان اپنی انفرادیت کے سبب ایک الگ آہنگ رکھتا ہے۔اس لیے ان کا اسلوب رنگارنگ شخصیت کا آئینہ دار ہے۔شبلی نے سرسید کی ہمہ گیر عقل پسندی کو معتدل بنانے کی کوشش کی اور عقل و وجدان کے درمیان ایک معقول رابطہ پیدا کرنے کی سعی کی۔شبلی کی طرز اور طرز بیان عالمانہ اور ادیبانہ ہے۔وہی بات جو سرسید کی زبان سے ادا ہوکر مخاطبوں کو متوحش کردیتی ہے جب شبلی کے منہ سے نکلتی ہے تو نہایت مانوس معلوم ہوتی ہے۔اس کا ذمہ دار زیادہ تر شبلی کا طرز تحریر اور لب ولہجہ ہے۔

سرسید کے رفقا میں شبلی کے بعد اگر کوئی شخص مورخانہ امتیاز کا مالک ہے تو وہ مولوی ذکاءاللہ

ہیں۔ان کا بڑا کارنامہ تاریخ ہندوستان ہے۔ذکاءاللہ کے نزدیک تاریخ کی عملی قدرومنزلت یہ ہے کہ اس میں علم معاشرت وتمدن کو بہ توضیح وتفصیل بیان کیا ہو اور قوموں کی سوانح عمری اس طرح بیان کرے کہ ان کی تمدنی معاشرت کا باہمی مقابلہ کا سامان بہم پہنچ سکے تا کہ آئندہ زمانے کے لیے ان قطعی قوانین کا تصیفہ ہوجائے جن کے مطابق تمدنی واقعات پیش آتے ہیں۔ذکاءاللہ اپنے استاد ماسٹر رام چندر کی طرح مضمون نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔وہ تہذیب لاخلاق کے ایک اہم مقالہ نگار تھے۔انہوں نے مختلف قسم کے بے شمار مضامین سپرد قلم کئے ہیں مگر ان کے خیالات دبے دبے نظر آتے ہیں۔وقارالملک بھی سرسید کے مشن اور دعوت فکر سے متاثر ہوکر ان کے خیالات کو اپنا مطمح نظر بنایا اور قومی فلاح کی جدوجہد میں وہ سرسید کے دوش بدوش چلنے کی کوشش کی۔جب تہذیب لاخلاق جاری ہوا تو وقارالملک بھی سرسید کے افکار وخیالات کی حمایت میں مضامین لکھنے لگے۔

سرسید کو شبلی نے بجا طور پر اردو انشا پردازی کا "مجدد" اور "امام" کہا ہے۔انہوں نے اردو ادب کو نیا روپ، نیا آہنگ اور نیا عزم سفر بخشا۔اردو نثر ایک مدّت سے دوراز کار تشبیہات، لایعنی استعارات اور شاعرانہ مبالغہ آرائی کے پیچ وخم میں گم تھی اور الفاظ کے گورکھ دھندوں نے اس کی فکری توانائی کو مضمحل کر دیا تھا۔سرسید نے اس کو افکار کی نئی دنیا دکھائی اور اس میں سفر کرنا سکھایا۔سرسید کا یہ کارنامہ اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا کہ انہوں نے اردو زبان کو ایسی توانائی بخشی کہ وہ ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی اور فلسفیانہ غرض ہر قسم کے افکار اور مضامین کو صفائی، سادگی اور پر تاثیر انداز میں ادا کرنے کے قابل بن گئی۔سرسید نے اردو شاعری کا رخ بدل دیا اور اس کو قومی اور اصلاحی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔وہ شاعری کے ذریعہ قوم کے افکار ونظریات میں تبدیلی لانا چاہتے تھے۔حالی نے نیچرل شاعری کے متعلق جو بحث کی ہی اور اردو شاعری کو جس طرح سوسائٹی کے تابع بتایا، وہ حقیقت میں سرسید کے ہی خیالات کے صدائے بازگشت ہے۔اگر سرسید نے اردو شاعری کو گل وبلبل، لب ورخسار، ہجر ووصال کے دھندوں سے نکال کر قومی مسائل کی ترجمانی کی طرف مائل نہ کر دیا ہوتا تو اردو شاعری جنگ آزادی میں وہ گراں قدر حصّہ نہ لے پاتی جو اس نے لیا۔اردو شاعری نے افکار حیرت کو عوام تک پہنچایا اور ان کے قلب وجگر گرما کر جنگِ آزادی کے لیے تیار کیا۔اردو زبان کی ترقی کے لیے اور اس بنیادی اصول کے پیشِ نظر کہ تعلیم کا سارا نظام مادری زبان میں ہونا چاہیے، سرسید نے اردو یونیورسٹی کے قیام کا منصوبہ بنایا۔اسی مقصد کو سامنے رکھ کر انہوں نے انگریزی کی بہت سی کتابیں اردو میں ترجمہ کرائیں۔لیکن انگلستان جانے کے بعد ان کے خیالات

میں تبدیلی واقع ہوئی۔اورانہوں نے محسوس کیا کہ ترجموں کے ذریعے کوئی قوم اس قابل نہیں ہوسکتی کہ ذہنی طور پر آزاد ہوکر ترقی کی راہ پر دوسری قوموں کے شانہ بشانہ چل سکے۔سرسید نے ایک گرامر مرتّب بھی کر لی۔یہ زمانہ وہ تھا جب انگریز حکام بھی اردو سیکھنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔انہیں کی ضروریات کے پیش نظر سرسید کو گرامر مرتّب کرنے کی خیال پیدا ہوا تھا۔سرسید اردو زبان کی ترقی کے لیے ٹائپ کا استعمال ضروری سمجھتے تھے،اور اس کو لیتھو پر ترجیح دیتے تھے۔اگر سرسید کی ٹائپ کی تحریک کامیاب ہوجاتی تو اردو زبان میں طباعت واشاعت کا کام کسی اور منزل پر پہنچ جاتا۔حقیقت یہ ہے کہ سرسید نے اردو ادب کی اتنی عظیم الشان اور مختلف النوع خدمات انجام دی تھیں کہ اردو زبان وادب کی پوری تاریخ میں کوئی دوسرا شخص ان کی ہمسری کا دعوٰی نہیں کر سکتا۔سرسید کے رفقا نے تاریخ اور سوانح نگاری میں بڑی دلچسپی لی اور یہ ذوق وشغف بھی سرسید کی بعض علمی سرگرمیوں سے پیدا ہوا۔سرسید کے لیے تاریخ کا ذوق ایک موروثی چیز تھی۔ان کے اسلاف قلعہ معلٰی سے وابستہ تھے اور اس سبب سے درباری مذاق کی اکثر چیزوں سے ان کا لگاؤ خاندانی روایت کے زیر اثر تھا۔اس تعلق کی یادگار" جام جم" نام کا ایک رسالہ ہے۔سید صاحب کو تاریخ سے اس وقت تک دلچسپی رہی جب تک ان کی زندگی میں" جدید سیاسی دینیت " کا رنگ کچھ زیادہ گہرا نہ ہوا۔اگر چہ سید صاحب نے بعد میں دوسرے اشغال کے سبب تاریخ سے توجہ کو ہٹالیا مگر ان کا ذہن تاریخ نگاری کے لیے حد درجہ موزوں تھا۔" آثارالصنادید " جو آثار وعمارت پر ایک عظیم کتاب ہے ان کے تحقیقی شغف کا ثبوت مہیا کرتی ہے۔انہوں نے پرانی تاریخی کتابوں کی تصحیح واشاعت پر بھی توجہ صرف کی۔آئین اکبری، تزک جہانگیری اور تاریخ فیروز شاہی اس کی مثالیں ہیں۔تاریخ نگاری کے معاملے میں سرسید کو سب سے زیادہ ہندوستان کی تاریخ سے دلچسپی رہی ہے۔

اردو کی سوانح عمری عرصے تک سرسید کی تحریک سے متاثر رہی۔یہ اس طرح کہ اس دور کی ساری سوانح نگاری قومی ترقی کے مقصد سے فروغ پاتی رہی اور قوم کی ترقی سرسید کی تحریک کا اصول اولین تھا جس کے تحت اس زمانے کا سارا ادب مقصدی اور منفعتی بن کر اجتماعی مقاصد کا آلہ کار بنا رہا۔حالی کی اولین سوانح عمریاں سادہ اور ادبی سوانح عمریاں ہے۔مگر ان دونوں میں بھی قومی خدمت پیش پیش ہے۔ان میں انہوں نے قوم کے لیے خوش طبعی ،ظرافت اور زندہ دلی عمدہ نمونے تیار کیے ہیں۔شبلی کی طرح شرر نے بھی اسلاف میں سے برگزیدہ اشخاص کو منتخب کر کے ان کی سیرتوں کو مشعل راہ بنانے کی اپیل کی ہے۔شبلی نے جہاں غیر معمولی ہستیوں کی مکمل زندگیوں کو پیش کیا ہے وہاں شرر

نے محض دلچسپ شخصیتوں کی ہمہ رنگ سیرتوں کے صرف چند پہلوؤں کے خاکے پیش کیے ہیں۔مگر اس غرض سے کہ قوم کو ان بزرگوں سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔غرض سرسید اور ان کے رفقا کے وجہ سے اردو سوانح نگاری ادب کی دوسری شاخوں کی طرح قوم اور اجتماع کی خادم بنی رہی۔

اردو میں مضمون نگاری کی تحریک بھی عملاً سرسید نے ہی اٹھائی۔مضمون سے مراد وہ صنف ہے جسے انگریزی میں ایسا ے ((Essay کہا جاتا ہے۔تہذیب لاخلاق کے ذریعہ انہوں نے مضمون لکھنے کی وہ روش عام کی جو ان کے بعد ترقی پا کر لطیف عمدہ ،فرحت بخش اور خوش گوار ادبی مضمون کی صورت میں منتقل ہوئی۔سرسید کے سب مضامین پر ایس سے کی شرائط پوری نہیں ہوئیں مگر انہوں نے متعدد مضامین ایسے لکھے جن کو ہم اس صنف کا مناسب نمونہ قرار دے سکتے ہیں۔اردو کا اولین اور غالباً عظیم ترین مضمون نگار بھی علی گڑھ کی خاک سے ہی پیدا ہوا، وہ سجاد یلدرم تھا۔غرض علی گڑھ تحریک کو عام طور پر محض تعلیمی یا سیاسی تحریک خیال کیا جاتا ہے مگر حق یہ ہے کہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔یہ ایک لحاظ سے فکری،تہذیبی،علمی اور ادبی تحریک بھی تھی۔یہ صحیح ہے کہ ایک معین مدت کے بعد علی گڑھ تحریک ایک ادبی مکتب اور علمی دبستان ہونے کے بجائے ایک خاص طرز زندگی اور ایک خاص انداز نظر بنایا گیا تھا جس کے اوصاف میں خوش گفتاری،خوش باشی،خوش پوشی اور آزاد خیالی کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔مگر اس میں شک نہیں کہ بعد علی گڑھ نے جتنا کچھ ادب پیدا کیا اس میں بھی اور جو انداز حیات اختیار کیا اس میں بھی عقل پسندی،سلیقہ، مادی اقدار، زندگی اور دنیاوی ہوش مندی کے عناصر خاصے ابھر رہے۔علی گڑھ تحریک کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اردو ادب کو ایک زندہ نثر اور دلکش اسلوب دیا۔اس تحریک نے نئے اصناف ادب کی شروعات کے ساتھ پرانے اصناف ادب پر بھی گہرا اثر قائم کیا اور اپنی تخلیقات سے اس کے دامن کو مالا مال کیا۔

☆☆☆

Sayyad Yousfe Husaini aur unke ham-asra Ulema-o-Shoara ka Mukhtasaran Ta-ar-ruf by Akhtarunnisa (Research Scholar dept. of Persian Aligarh Muslim University, Aligarh)

اختر النساء (ریسرچ اسکالر شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

سید یوسف حسینی اوران کے ہمعصر علماء وشعراء کا مختصراً تعارف

سید یوسف حسینی تغلق عہد کے صوفی صفت شاعر اور ہندوستان کے مشہور ومعروف صوفی بزرگ سید بندہ نواز گیسو دراز کے والد محترم ہیں ۔سید یوسف حسینی ایرانی النسل تھے ۔ان کے ابا ؤاجداد سلطان مسعود کے عہد حکومت میں ہرات سے دھلی ائے تھے۔شاہی دربار سے وابستگی کے ساتھ ساتھ دہلی ہی میں ہمیشہ کے لئے قیام پزیر ہو گئے۔نام سید یوسف حسینی ہے،سید راجہ،راجو قتال اور یوسف گدا کے نام سے معروف ہوئے ہیں۔انہوں نے خود اپنی ایک مثنوی میں یوسف گدا کا نام لیا ہے۔

گوید ہمی یوسف گدا در وعظ سخنی چند را

از بہر خلف خوش لقا بو الفتح آن نور البصر

ان کے والد کا نام سید علی حسینی ہے۔ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں کوئی معلومات فراہم نہیں ہوئی ہے۔اور ان کی وفات، ۵ شوال ۱۳۳۱ء میں دولت آباد میں ہوئی۔دولت آباد میں ہی مدفون ہوئے،ان کا مزار آج بھی وہاں موجود ہے اور ہر خاص و عام کی زیارت گاہ بنا ہوا ہے۔ہر سال ۵ شوال کو ان کے برصی کے دن لوگ عرس مناتے ہیں۔ان کے دولت آباد جانے کی وجہ کے بارے میں تذکروں میں تحریر ہے کہ جب ۱۳۲۶ء میں محمد بن تغلق نے دارالسلطنت دیو گیر (یعنی دولت آباد) منتقل کیا،تو اس نے دہلی سے علماء وشعراء کو بھی جانے کا حکم دیا۔اس وقت ہجرت کرنے والوں میں فخر الدین زرادی،امیر حسن سجزی،مولانا برہان الدین غریب،زین الدین داؤد شیرازی اور سید یوسف حسینی بھی اپنے اہل وعیال کے ساتھ شامل تھے۔انہوں نے ''تحفۃ النصائح'' کے نام سے مختلف موضوعات پر مثنویات کا مجموعہ منظوم کیا ہے۔اس کے علاوہ ان کا ایک دیوان بھی ہے جو حیدرآباد کے سالار جنگ میوزیم کے شعبۂ مخطوطات میں محفوظ ہے۔تحفۃ النصائح انہوں نے اپنے بیٹے سید بندہ نواز گیسو دراز کی تربیت کرنے کے لئے منظوم کی ہے۔جسمیں قرآنی آیات وحدیث نبویؐ

کی تشریحات کوشاعری کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے۔جو کہ سراسر پندونصائح پر مشتمل ہے۔

فخر الدین زرادی: فخر الدین زرادی ہانسی میں ۶۵۱ ھ میں پیدا ہوئے تھے،اور کم عمر میں ہی تعلیم حاصل کرنے کے لئے دہلی آ گئے تھے۔اور جلد ہی اپنی دانش مندی،شیریں کلام،خوش بیانی کی بدولت اس عہد کے ممتاز علماء وصوفیا میں شمار کئے جانے لگے۔وہ خواجہ نظام الدین اولیاء کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔اپنے علم پروری،پرہیزگاری،صاحب علم،صاحب ذوق،اور عشق حقیقی کے سبب خواجہ نظام الدین اولیاء کے خلیفہ مقرر ہوئے۔وہ حافظ قرآن تھے۔قرآن مجید کی کتابت ہی ان کی ذریعۂ معاش تھی۔وہ سیر وسیاحت کے بہت ہی شوقین تھے۔

امیر حسن سجزی: امیر حسن سجزی ۶۵۵ ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے،یہیں پرورش پائی،اور دہلی کے مشہور ومعروف شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔وہ اپنی عمدہ گفتگو اور مجلسی ادب کی وجہ سے بہت مقبول ہوئے۔علماء وشعراء کی مجلس اور خاص طور سے حضرت نظام الدین اولیاء کی محفل میں ان کی بہت قدر و منزلت تھی۔امیر حسن اور امیر خسرو گہرے دوست تھے۔دونوں ہی شاہی دربار سے وابستہ تھے۔او خواجہ نظام الدین اولیاء کے مقرب مریدوں میں سے تھے۔امیر حسن اور خواجہ صاحب کے بارے میں کئی واقعات معروف ومشہور ہیں،ایک واقعہ یہ ہے کہ''ایک دن شمسی تالاب کے کنارے پر بیٹھ کر خوردونوش فرمارہے تھے۔کہ اتفاقاً خواجہ نظام الدین اولیاء کا وہاں سے گذر ہوا۔امیر حسن نے ان کو دیکھ کر ایک قطعہ پڑھا جو حسب ذیل ہے۔

سالہا باشد کہ ما ہم صحبتم　　　گر ز صحبتہا اثر بودی کجاست

زھد تان فسق از دل ما کم نکرد　　　فسق ما بہتر از ز ھد شماست

یہ سن کر خواجہ صاحب نے جواب دیا''صحبتھا را اثر است''پھر امیر حسن خواجہ صاحب کے مرید ہو گئے۔امیر حسن دہلوی کو اپنے پیرومرشد خواجہ نظام الدین اولیاء سے اس قدر محبت تھی کہ ان کے ہمراہ رہ کر اپنے پیرومرشد کے تمام حرکات وسکنات کو بغور دیکھتے رہتے جس کے نتیجہ میں وہ حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات کو جمع کرتے تھے،اور تحریر کرنے کے بعد مرشد سے اس کی تصدیق بھی کراتے تھے۔ملفوظات کے اس مجموعہ کو''فوائد الفواد''کا نام دیا گیا ہے۔یہ تصنیف اتنی اہم اور قابل قبول تھی کہ خود امیر خسرو نے اس تصنیف کے متعلق کہتے تھے۔کہ کاش امیر حسن اس کتاب کو میرے نام کر دیتے اور میرے سارے کلام کو لیتے۔فوائد الفواد نہ صرف اپنے عہد میں بلکہ بعد کے دور میں بھی بہت مشہور ومقبول ہوئی۔امیر حسن بنیادی طور پر غزلیات کے شاعر تھے۔ان کے

غزل بہت ہی پر اثر ہے۔وہ عشق حقیقی ومجازی کے شیدائی تھے۔جس بنا پر وہ سعدی ہند کے نام پر معروف ہیں۔اوران کی غزلوں میں عشق وتصوف دونو کی چاشنی ہے۔غزل کے علاوہ ''مخ المعانی اور انیس الارواح''ان کی تصنیف ہے۔

برہان الدین غریب:۔شیخ برہان الدین غریب نواز ہانسی ۶۵۶ھ میں پیدا ہوئے۔وہ خواجہ نظام الدین کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔اورخواجہ صاحب خاص مقربوں میں ان کا بھی شمار ہوتا تھا ۔برہان الدین کے تعلقات امیر حسن اورامیر خسرو کے ساتھ بہت ہی ہموار تھے۔وہ خوش مزاج اور لطافت طبع کے مالک تھے۔جیسا کہ تذکروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ نصرالدین چراغ دہلوی تعلیم حاصل کرنے کے درمیان ان کے گھر پر قیام کرتے تھے۔اس وقت برہان الدین غریب ان کی نماز کے وقت امامت کرتے تھے۔وہ بھی اپنے پیرومرشد کی پیروی میں سماع کے دلدادہ تھے ۔وہ وجدورقص میں ایک الگ اور خاص قسم کا طرز اپنائے ہوئے تھے۔جس کی وجہ سے وہ برہانی کے نام سے معروف ہوئے۔خواجہ نظام الدین اولیاء کی طرف سے ان کوخلافت ملی تھی۔خلافت کے بعد ۷۲۷ھ میں محمد بن تغلق کے دہلی سے دولت آباد بھیجے ہوئے علماء وشعراء کے ہمراہ وہ بھی دیوگیر چلے گئے تھے۔ان کے خوش ذوقی کے سبب دولت آباد میں عوام ان کے بہت معتقد تھی۔اور برہان پور انہیں کے نام پر بسایا گیا ہے۔ان کا ۷۳۵ھ میں دولت آباد میں ہی انتقال ہوا تھا۔

ان کے علاوہ اس دور میں بہت ہی نایاب اور قابل علماء،صوفیاء وشعراء کا گزر رہوا ہے۔ان میں ضیاءالدین نخشبی،ضیاءالدین برنی،مولانا معین الدین عمرانی،شیخ ضیاءالدین سمنانی،مولانا ناصر الدین ترمذی،امیر خورد،شہاب الدین،مسعود بک،امیر خسرو،نصرالدین چراغ دہلوی جیسی عظیم شخصیتوں کا تعلق رہا ہے۔جو نہ صرف خود عمل پیرا رہے ہیں۔بلکہ یہ اپنے دور میں اوراس کے بعد کے عہد کے لئے بھی مشعل راہ رہے ہیں۔اس دور میں بیش بہا اور صوفیاء عقائد سے متعلق کتابیں وجود میں آئیں جو بعد آنے والوں کے لئے رشد وہدایت کا سبب بنیں۔

ماخذ:۔1۔تحفہ النصائح،سید یوسف حسینی ،نسخہ مولانا آزاد لائبریری 2۔فوائد حضرت بندہ نوازؒ،مرتب،محمد معشوق حسین خان سلطانی 3۔تذکرہ خواجہ گیسودراز،مرتب،اقبال الدین احمد
۴۔سیرت پاک خواجہ سید محمد گیسودراز،مولف،شبیر حسین چشتی نظامی ۵۔اخبارالاخیار،مترجم،مولانا سجاد محمود صاحب 6۔فارسی ادب بعہد سلاطین تغلق،مصنف ڈاکٹر شعیب اعظمی 6 History of Indo-Persian Literature ,Nabi Hadi Iran Culture House ,new Delhi ,2001

Mutamad Khan : Ahd-e-Jahangir ka naamvar adeeb-o- moarrikh by Rahila Tabassum (Research Scholar dept. of Persian Aligarh Muslim University Aligarh

راحیلہ تبسم (ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

معتمد خان: عہد جہانگیر کا نامور ادیب و مورخ

ہندوستانی تاریخ میں عہد مغلیہ فارسی زبان و ادب کی ترویج و پیشرفت کے لحاظ سے ایک زرین دور مانا جاتا ہے۔ اس دور میں فارسی شاعری کے ساتھ ساتھ فارسی تاریخ نگاری کو بھی کافی عروج وترقی حاصل ہوئی۔ متعدد تعداد میں ادبا، شعرا، علما و فضلا بیرونی ممالک سے وارد ہند ہوئے جنہوں نے اس شیرین زبان کو اپنے اظہار خیال کا وسیلہ بنایا جس سے اس زبان کو تقویت و فروغ ملا اور کثیر تعداد میں بزبان فارسی تصنیفات و تالیفات منظر عام پر آئیں۔ اس دور میں سرزمین ہندان فارسی شعرا و ادبا کا مرکز رہی جنہوں نے فارسی ادب کے دامن کو وسعت دینے کے لئے کئی علمی و ادبی خدمات انجام دیں۔ اس محفل ادب کو منور کرنے کے لیے بابر، ہمایوں، اکبر اور جہانگیر کا عہد حکومت کافی اہمیت کا حامل ہے۔ عہد جہانگیر میں بیشتر شعرا، علما، ادبا و مورخین کے نام اہمیت کے حامل ہیں جنہوں نے اپنے کمالِ فن سے فارسی ادب کو بام عروج تک پہنچایا، ان میں ایک نام جہانگیر کے ندیم خاص اور اس عہد کے نامور مورخ و ادیب محمد شریف معتمد خان کا ہے۔

عہد جہانگیری کا سب سے مشہور مورخ با ضابطہ طور پر خود بادشاہ نورالدین جہانگیر کو مانا جاتا ہے، جس کی تصنیف "تزک جہانگیری" دنیائے ادب میں اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے۔ "تزک جہانگیری" اگرچہ سوانح ہے لیکن اس میں ادبی و تاریخی واقعات پر روشنی بھی پڑتی ہے اس بنا پر اس کو ادبی و تاریخی دنیا میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس کتاب کو تحریر کرنے میں جہانگیر کی مدد اس کے ندیم خاص محمد شریف معتمد خان نے کی۔ معتمد خان کا شمار جہانگیر کے دور کے مستند و معروف تاریخ نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس ضمن میں توفیق، ھ، سبحانی اس طرح رقم طراز ہیں:

"معتمد خان ندیم خاص جہانگیر و رئیس وقائع نگاران درباروی بود۔"

(نگاہی بہ تاریخ ادب فارسی در ہند، ص، 388)

معتمد خان کا اصل نام محمد شریف اور والد ماجد کا نام محمد خان تھا۔ یہ ایران کے باشندے

تھے، لیکن ایران میں انہیں کوئی شہرت ومقبولیت حاصل نہ تھی۔ جب ایران سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تو یہاں بادشاہ جہانگیر کے دربار میں رسائی حاصل کی اور اس کے خاص رفقا وملازمین میں شامل ہو گئے۔ بادشاہ نے اپنی تخت نشینی کے جلوس سال سوم یعنی 1016ھ میں انہیں "معتمد خان" کا خطاب عطا کیا۔ اس بارے میں اس وقت کے ایک خوش طبع شاعر نے ایک بیت کہا ہے جس کو صمصام الدولہ نے اپنی تصنیف "مآثر الامرا" میں اس طرح نقل کیا ہے:

"درسال سیوم بخطاب معتمد خان سرافرازی یافت۔ درحق اوظرفای مغلیہ آن وقت این بیت گفتند:
بیت ــــ بدور شاہ جہانگیر خانی ارزان شد شریفہ بانوی مارفت ومعتمد خان شد۔"
(مآثر الامرا، جلد 3، ص، 431)

بادشاہ جہانگیر نے معتمد خان کو خطاب دینے کے ساتھ ساتھ منصب دار بھی مقرر کیا۔ 1025ھ میں تخت نشینی کے نویں سال جلوس میں سلیمان خان فدائی کے فوت ہونے کے بعد بادشاہ نے انہیں بخشی کے عہدہ پر سرفراز کیا۔ بارہ سال جلوس میں یہ شہزادہ خرم کے ساتھ بطور بخشی فوج دلن کی مہم پر گئے۔ بعد ازاں 1028ھ میں بادشاہ جہانگیر جب کشمیر کے سفر پر روانہ ہوا تو اس وقت معتمد خان اس کے ہمراہ تھے، اس سفر کے دوران باقی امرا دربار بھی بادشاہ کے ساتھ تھے۔ بادشاہ نے یہ سفر گلگشت اور پکھلی کے راستے سے طے کیا کیونکہ پیر پنچال اس وقت برف سے ڈھکا ہوا تھا، پکھلی کا راستہ بہت ہی دشوار تھا۔ 1029ھ میں دریائے کشن گنگا کے کنارے سال جلوس کا جشن منایا، پھر اس راستے سے سارا سفر دریائے جہلم کے کنارے سے طے کیا۔ یہاں کے راستے تنگ اور دشوار گزار ہونے کی وجہ سے بادشاہ نے معتمد خان کو حکم دیا کہ کچھ امرا اور رعایا کو بادشاہ کے ساتھ نہ رہنے دیا جائے۔ معتمد خان نے دریائے بھلباس کے پاس قیام کیا جو موجودہ دور میں پھلیاس کے نام سے مشہور ہے، وہاں خیمے لگائے گئے۔ کشمیر کے سفر کے دوران ہی بادشاہ نے معتمد خان کو پنج ہزاری کا منصب عطا کیا۔ کشمیر سے واپس آنے کے بعد بادشاہ نے انہیں میر جملہ کی جگہ 'عرض مکرر' کے عہدہ پر فائز کیا۔ بادشاہ جہانگیر نے اپنے سترہویں سال جلوس میں معتمد خان کو تزک مرتب کرنے کا حکم دیا۔ (تزک، ص352)

جہانگیر بادشاہ کی وفات کے بعد شاہجہان کے دور حکومت میں بھی معتمد خان اعلی عہدے پر فائز تھے۔ بادشاہ نے انہیں چار ہزاری منصب عطا کیا، یہ بادشاہ کے خیر خواہ وخیر اندیش تھے۔ شاہ جہاں نے جب سلطنت سنبھالی تو اسے اپنے قریبی امرا میں شامل کرنے کے ساتھ ان کے منصب میں

بھی مزید اضافہ کیا۔اس سلسلے میں مؤلف مآثر الامرا نے یوں لکھا ہے:

"چون بدولتخواہی شاہزادہ شاہ جہان مشہور بود بعد از جلوس باضافہ منصب و بمزید قرب و اعتبار اختصاص گرفت۔" (مآثر الامرا،جلد3،ص433)

سال دوم کے جلوس میں بادشاہ نے انہیں بخشی دوم مقرر کیا۔ بعد ازیں شاہجہان کی تخت نشینی کے دسویں سال جلوس میں جب میر جملہ کا انتقال ہو گیا تو بادشاہ نے معتمد خان کو میر بخشی کا منصب دیا اور کچھ مدت بعد چار ہزاری ذات اور دو ہزاری سوار کا منصب سے سرفراز کیا۔اس بارے میں مآثر الامرا میں اس طرح بیان ہے:

" درسال دوم از تغیر اسلام خان بہ بخشیگیری دوم سر برافراخت۔ و درسال دہم از انتقال میر جملہ بتفویض خدمت والای میر بخشیگیری واز اصل اضافہ بمنصب چار ہزاری در ہزار سوار بلند مرتبہ گردید۔ و درہمین سال باعانت سیورام کور برادرزادہ راجہ بتہل داس باتفاق راجہ مذکور بولایت دہندیرہ تعین گشت۔معتمد خان اندرمن زمیندار آنجارا گرفتہ بحضور آورد۔"(ایضاً،ص433)

معتمد خان نے اکبر آباد آگرہ میں مسجد بھی بنوائی جو "مسجد معتمد" کے نام سے مشہور ہے۔ معتمد خان کی وفات شاہ جہاں کے تیرہویں سال جلوس یعنی 1049ھ میں ہوئی۔معتمد خان کی مشہور تصنیف "اقبالنامہ جہانگیری" ہے، یہ اس دور کی مستند تاریخ تسلیم کی جاتی ہے۔ یہ تصنیف تیموریوں کی تاریخ پر مبنی ہے۔اس کتاب کو مصنف نے تین جلدوں میں منقسم کیا ہے۔پہلی جلد میں عہد تیمور سے لے کر عہد ہمایوں تک کے حالات و واقعات تفصیلاً تحریر ہیں۔ دوسری جلد میں عہد اکبری کے حالات و واقعات بیان کئے ہیں اور تیسری جلد میں عہد جہانگیری کے اکیس سالہ واقعات کو قلمبند کیا ہے۔اس جلد میں مصنف نے تمام چشم دیدہ حالات و واقعات اور مشاہدات کو مکمل طور پر ضبط تحریر میں لایا ہے۔معتمد خان اور ان کی تصنیف کے متعلق سی۔ایچ۔فلپس نے کتاب "Historians of India, Pakistan And Ceylon" میں اس طرح تحریر کیا ہے:

"Mutamad Khan, who was Persian by birth, held important posts under Jahangir. His Iqbal Namah-i-Jahangiri, who was compiled at the insistence of the Emperor, gives an account of the history of babur, Humayun, Akbar and Jahangir. For the first seventeen years of Jahangir's reign he mainly depended on Jahangir's Memoirs."

(p, 149)

"اقبالنامہ جہانگیری" کا مکمل نسخہ نول کشور لکھنو سے 1870ء میں طبع ہوا۔ اس کتاب کے پہلے اور دوسرے حصے میں مصنف نے ابوالفضل علامی کے 'اکبر نامہ'، نظام الدین کی کتاب 'طبقات اکبری' اور عطا بیگ کی تصنیف تاریخ اکبری' سے استفادہ و اکتساب کیا ہے۔ تیسری جلد میں سترہ سال کے واقعات بادشاہ جہانگیر نے لکھے ہیں اس کے بعد کے واقعات کو معتمد خان نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کی پہلی دو جلدیں مفقود ہیں۔ جلد سوم 1865ء میں سلسلہ کتب ہندیہ کلکتہ اور 1898ء میں نول کشور لکھنو سے شائع ہوئی، اس کے کئی تراجم ہو چکے ہیں۔ ایک ترجمہ راجہ راجیشور اور اصغر نے "کارنامہ جہانگیری" کے نام سے کیا ہے جو کارخانہ پیسہ اخبار لاہور سے 1906ء میں طبع ہوا۔ اقبالنامہ جہانگیری کے علاوہ معتمد خان نے ایک اور کتاب تصنیف کی جو "احوال شاہزادگی شاہجہان" کے نام سے مشہور ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر آفتاب اصغر اس طرح لکھتے ہیں:

"معتمد خان علاوہ اقبالنامہ جہانگیری و ذیل جہانگیر نامہ اثر دیگر تاریخی موسوم بہ "احوال شاہزادگی شاہجہان" از خود بیادگار گذاشتہ است کہ در باب بعدی ضمن تواریخ دورہ شاہجہانی مورد بحث قرار میگیرد۔" (تاریخ نویسی فارسی در ہندو پاکستان، ص262)

مختصر یہ کہ معتمد خان عہد مغلیہ خصوصاً عہد جہانگیر کے مشہور و معروف ادبا و مورخین میں سے تھے۔ ان کی تحریر کردہ تصنیف ''اقبالنامہ جہانگیری'' کو فارسی کتب تواریخ میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔

منابع و مآخذ:

۱۔ نگاہی بہ تاریخ ادب فارسی در ہند، مولف دکتر توفیق ھ، سبحانی

۲۔ تذکرہ مورخین، چودھری نبی احمد صاحب سندیلوی

۳۔ مورخین ہند، مولف حکیم سید شمس اللہ قادری

۴۔ بزم تیموریہ، سید صباح الدین عبدالرحمٰن

۵۔ تاریخ نویسی فارسی در ہندو پاکستان، مولف دکتر آفتاب اصغر

۶۔ مآثر الامر، مولف نواب صمصام الدولہ شاہنواز خان، تصحیح جناب مولوی مرزا اشرف علی

۷۔ Historians of India, Pakistan And Ceylon، مولف سی۔ ایچ۔ فلپس

☆☆☆

Waheeduddin Salim Panipati: bahaisiyat Jayyad Alalim-o-qaumi Shair by Samira Khanam (Research Scholar dept. of Urdu Arabic and Persian, Punjabi University, Patiala

ثمیرہ خانم (ریسرچ اسکالر، شعبہ ءفارسی، اردو اور عربی، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ)

وحیدالدین سلیم پانی پتی: بحیثیت جید عالم وقومی شاعر

ہریانہ میں مولانا الطاف حسین حالؔی کے بعد شاعر, ادیب سوانح نگار، نقاد کے علاوہ اردو کے ایک جید عالم کی حیثیت سے جن عظیم شخصیتوں کا نام ذہن میں آتا ہے ان میں وحیدالدین سلیم پانی پتی بھی شامل ہیں۔ وہ ہندی, عربی, فارسی اور اردو کے جیّد عالم اور صحافی بھی تھے۔ وضعِ اصطلاحات ان کا خاص وصف تھا۔ ان کا تعارف مولوی عبدالحق کچھ یوں کراتے ہیں:

"اسی سرزمین پانی پت کے فرزند ہیں جس نے جدید رجحانات کے پہلے علمبردار مولانا الطاف حسین حالی کو جنم دیا۔ پروفیسر وحیدالدین سلیم پانی پتی ایک بلند پایہ عالم, محقق, نثر نگار, شاعر, ماہر لسانیات اور وضع اصطلاحات رہے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ قائم ہوئی تو وہ اردو کے پہلے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے اور بعد ازاں پروفیسر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں انھوں نے اپنی کتاب ''وضع اصطلاحات'' تصنیف کی جو اصلاح سازی کے فن پر اردو میں پہلی کتاب مانی جاتی ہے۔'' (چند ہم عصر, ص45)

مولانا وحیدالدین سلیم 1869ء میں پانی پت کے ایک معتبر خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد فریدالدین حضرت شاہ شرف الدین بوعلی قلندر کی درگاہ کے متولی تھے۔ ابتدائی تعلیم پانی پت کے مدارس اور اسکولوں میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے لاہور چلے گئے۔ لاہور میں عربی اور فارسی میں دسویں کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد ریاست بہاولپور میں محکمہ تعلیم میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہوگئے۔ بعد ازاں ریاست رامپور میں ہیڈ مولوی کے طور پر خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد پانی پت آگئے اور پانی پت میں ایک مکتب قائم کیا۔ اسی دوران آپ کی الطاف حسین حالی سے قربت بڑھی اور حالی کی وساطت سے سرسید احمد خاں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

سرسید احمد خاں آپ کی قابلیت اور علمیت کے قائل ہوئے اور وحید الدین سلیم کو اپنا سیکریٹری بنالیا۔ قابل ذکر ہے کہ ان کا رشتہ سرسید احمد خاں کی وفات تک قائم رہا۔ سرسید کی وفات کے بعد مولانا وحید الدین سلیم نے صحافت کی دنیا میں قدم رکھا اور ایک رسالہ "معارف" شائع کرنا شروع کیا۔ اس کے علاوہ موصوف کئی دیگر اخبار و رسائل مثلاً اخبار سائنٹفیک سوسائٹی علی گڑھ گزٹ، مسلم گزٹ لکھنؤ اور زمیندار جیسے اخبارات میں اعلیٰ عہدوں پر صحافتی خدمات انجام دیتے رہے۔

آپ کی مضمون نویسی اور ترجمہ نگاری سے متاثر ہوکر آپ کو ریاست حیدرآباد کی جانب سے نوکری کی پیشکش کی گئی۔ وہاں پر آپ نے دارالترجمہ میں ایک اہم کتاب ''وضع اصطلاحات'' تخلیق کی۔ بعد ازاں 1918ء میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی۔ جس میں مولوی عبدالحق دارِترجمہ کے ناظم تھے۔ دارالترجمہ میں انگریزی کی کتابوں کا ترجمہ کرنے میں اصطلاحات وضع کرنے کا مسئلہ درپیش آیا تو بابائے اردو مولوی عبدالحق کی نظر میں وحید الدین سلیم ؟ کا نام آیا۔ جنھوں نے انھیں شمالی ہند سے بلا کر دارِالترجمہ کی وضعِ اصطلاحات کمیٹی کا صدر بنا دیا۔ جامعہ عثمانیہ کے باقائدہ عمل قیام میں آنے کے بعد شعبہ اردو کا بھی قیام عمل میں آیا تو وحید الدین سلیم کو مختلف زبانوں پر فوقیت حاصل ہونے کی وجہ سے صدر شعبہ اردو اور پروفیسر بنا دیا گیا۔ اس سے پہلے کسی بھی یونیورسٹی میں باضابطہ طور شعبہ اردو اور پروفیسر کا عہدہ نہ ہونے کی وجہ سے پانی پت کے ایک فرزند کو اردو کے پہلے پروفیسر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔

سلیم کو وضعِ اصطلاحات پر بے حد عبور حاصل تھا۔ حیدرآباد آنے سے پہلے سلیم ایک اخبار نویس تھے۔ انھوں نے اپنے اخبار کے لئے انگریزی الفاظ 'والنٹیر' کے لئے 'رضا کار' اور 'سب مرین' کے لئے 'آبدوز کشتی' الفاظ وضع کئے جن کے پہلے کوئی اردو متبادل الفاظ نہیں تھے۔ مولوی عبدالحق کے کہنے پر ہی سلیم نے 'وضعِ اصطلاحات' نامی کتاب لکھی جسے انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے مولوی عبدالحق کے کہنے پر انجمن ترقی اردو کے رسالہ کے لئے بہت سے علمی و ادبی مضامین لکھے۔ ادبی لحاظ سے یہ زمانہ ان کے لئے اور اردو ادب کے لئے بڑا زرخیز رہا۔ اس زمانے میں ان کی عمر تقریباً 60 برس تھی مگر جوش اور ولولہ نوجوانوں جیسا تھا۔ اسی لئے انھوں نے انتہائی ذوق وشوق سے اپنے سبھی کاموں کو سرانجام دیا۔ 1927ء میں حیدرآباد میں اس دنیائیفانی سے کوچ کر گئے۔

آپ کی تصانیف میں سے چند اہم کتب میں سے "اردو دیومالا"، "عربوں کی شاعری"، "تلسی داس کی شاعری"، "افادات سلیم" (مضامین کا مجموعہ 1938) "افکارِ سلیم" (مرتب محمد اسماعیل پانی

پتی1938)"مرغیوں کا علم "،" حیات ابنِ جبیر "،" مضامین سلیم" اورضع اصطلاحات 1931) ہیں۔مولانا وحیدالدین سلیم کی ایک مرتب کردہ کتاب مضامین حالی ہے۔سلیم اپنی شاعری کے ابتدائی سفر میں رویتی رنگ لئے ہوئے غزل لکھتے تھے اور مفتوں تخلص رکھتے تھے۔لیکن حالی سے قربت کے بعد آپ کی شاعری کا رنگ بالکل ہی بدل گیا۔روایتی شاعری سے نکل کر حقیقی دنیا میں آ گئے اور ہر عام و خاص کو''دعوت عمل'' کا پیغام دینا شروع کر دیا جس کی مثال ان اشعار میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہے

وہ خاک ہو کہ جس میں ملیں ریزہ ہائے زر وہ سنگ بن کہ جن سے نکلتے ہیں لعلِ ناب
چڑیوں کی طرح دانے پر گرتا ہے کس لئے پرواز رکھ بلند کہ تو بن سکے عقاب
وہ چشمہ بن,کہ جس سے ہوں سرسبز کھیتیاں رہرو کو تو فریب نہ دے صورتِ سراب

وحیدالدین نے انسان کو کامیاب ہونے کیلئے لئے بتایا کہ کہتے زندگی کا نام ہی حرکت ہے۔اس لئے زندگی کی دوڑ دھوپ سے نہ گھبرا, زندگی کی مشکلوں سے نہ ڈرا گر تم نے جینا ہے کیونکہ زندگی کا نام ہی حرکت ہے۔تمھیں جینے کے نبض کے خون کی مانند دن رات کام کرنا ہوگا۔تمھیں نڈر ہو کر نہنگ کی طرح زندگی کے طوفانوں سے ٹکرانا ہوگا۔تمھیں تلوار کی دھار پر چلنا سیکھنا ہوگا۔ورنہ تم زندگی میں کامیاب نہیں ہوسکو گے۔چند اشعار پیش خدمت ہیں:

زندگی نام ہے حرکت کا تم افسردہ نہ ہو نبض کے خون کی مانند اچھلنا سیکھو
نہ ڈر صدمہ طوفان سے، مانند نہنگ ورطہ بحر کی آغوش میں پلنا سیکھو

مولانا اس بات کو بخوبی جانتے تھے کہ کوئی بھی قوم نوجوانوں کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی۔اس لئیانہوں نے نوجوان نسل کو بیداری کا پیغام دیا تا کہ قوم جہالت کے اندھیرے سے نکلے اور دنیا کی دوسری قوموں کی طرح خوب ترقی کرے۔وحیدالدین نوجوانوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

نوجوانو! تمہیں ہم مردہ یقیں کر لیں گے اپنی ہستی سے نہ دُنیا میں اگر دھوم مچاؤ
وقت ہے چلّہ چڑھانے کا نشانے تا کو چٹکیوں میں نہ عبث, اپنی جوانی کو اُڑاؤ
پانوں جم جم کے رہِ حبّ وطن میں رکھو سکہ تھم تھم کے تم اپنا دِل عالم پہ جماؤ
کب تک اغیار کی صنعت پہ رہو گے حیراں اپنی ہمت کا مرقع کوئی دنیا کو دکھاؤ

مولانا وحیدالدین اپنے ملک کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کروانے کے خواہش مند تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ آزاد فضاؤں میں سانس لیں اور آزاد ہو کر اپنے ملک کی بہاروں سے لطف اندوز ہوں۔انھوں نے اپنے ان جذبات کا اظہار بہت ہی دلکش انداز میں اپنی نظم''نغمہ حریت''میں کیا

ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجئے:

مرے دل میں اُٹھتے ہیں ولولے, کہ ہوں کاش بادِ بہار میں
کبھی غنچہ پر ہو مرا گزر, کبھی پھول سے ہوں دو چار میں
کبھی گلشنوں کو بتاؤں میں وہ جو ضابطے ہیں سنگار کے
کبھی بلبلوں کو سکھاؤں میں, وہ جو زمزمے ہیں بہار کے

موصوف اپنی مختصر نظم ''جذبہ آزادی'' میں بھی ملک کی آزادی کے متعلق فکر مند ہیں۔ انھیں نہ صرف آزادی کے متوالوں سے پیار ہے بلکہ ان زندانوں سے بھی بڑی عقیدت ہے جہاں آزادی کے متوالوں کو قید کیا گیا۔ اشعار ملاحظہ کیجئے:

اگر آزادی ہندوستاں پنہاں ہے جیلوں میں — تو ہے مشتاق ہر ہندی درودِ یوار زنداں کا
قتیلِ خنجر بیداد کی کر لی زباں بندی — مگر ہے تھامنے والا بھی کوئی چشمِ گریاں کا

شاعر عام انسانوں سے زیادہ حسّاس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی نظر ماضی یعنی تاریخ پر بھی ہوتی ہے اور مستقبل پر بھی۔ خدا نے مولانا وحیدالدین سلیم کو بھی اس نعمت سے نوازا ہے۔ وہ ایک سمجھ دار عالم اور مفکر تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد دوسرے مفکرین کے تاثرات کیا رہے ہوں گے لیکن مولانا وحیدالدین کے مطابق یہ دنیا کی آخری جنگ نہیں تھی۔ ان کی نظر میں ایک جنگ کے بعد پوری دنیا دوسری جنگ کی تیاری میں لگی ہوئی ہے۔ موصوف کی اس پیشین گوئی کا اندازہ ان کی نظم ''آئندہ کا خواب'' کے ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے:

آگ اُگلنے کو تفنگوں نے دہن کھول دیئے — خوں فشاں خنجرِ تراں نظر آتے ہیں مجھے
منہ میں توپوں کے کھلے چرخ بریں کی جانب — صاعقے ابر کے رقصاں نظر آتے ہیں مجھے
غول طیاروں کے افلاک کی جانب ہیں رواں — گرتے اب قلعہ و ایوں نظر آتے ہیں مجھے

وحیدالدین نے اس نظم میں اس جنگ کے ذریعے ہونے والی تباہیوں اور بربادیوں کا ہولناک منظر نامہ پیش کیا ہے۔ ان کے الفاظ میں کچھ اشعار ملاحظہ کیجئے:

لہلہاتے ہوئے جو کھیت تھے جنگل میں کھڑے — آتشِ جنگ میں سوزاں نظر آتے ہیں مجھے
محفلیں عیش و طرب کی ہوئیں برہم ساری — خاک کے ڈھیر شبستاں نظر آتے ہیں مجھے
باغِ جنگ نظر آتے تھے مسافر کو جہاں — اب وہ سب مرحلے ویراں نظر آتے ہیں مجھے

موصوف انسانیت کے سچے ہمدرد تھے۔ ان کی نظر میں سبھی انسان یکساں تھے۔ وہ اس

بات کے سخت خلاف تھے کہ لوگ آپس میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر الجھیں اور دشمنی میں پھنس کر ایک دوسرے کو تباہ و برباد نہ کریں۔ان کی نظر میں ان لڑائی جھگڑے کی وجہ عقل کی فتنہ سامانی, ذہن کی فکر آزمائی, جذبہ نسل وقوم کی خوں ریزیاں اور دیر وکلیسا کے پرستاروں کے آپسی جھگڑے ہیں۔نظم ''ہنگامہ اتحاد'' میں قوم کے میل ملاپ کا پیغام ملاحظہ فرمائیں:

عقل کی دیکھی ہے ہم نے فتنہ سامانی بہت عشق کا ہنگامہ اب کوئی اُٹھانا چاہئے
ذہن کی فکر آزمائی سے ہے افسردہ بشر دل کے ارمانوں کا اب جلوہ دکھانا چاہئے
جذبہ نسل و وطن کی دیکھ لیں خونریزیاں خاک میں ان خنجروں کو اب دبانا چاہئے
ہے بپا دیر وکلیسا کے پرستاروں میں جنگ حب انسانی کا اب معبد بنانا چاہئے

مولانا وحید الدین سلیم کو شاعری پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ آپ فی البدیع اشعار کہہ دیتے تھے۔اس حوالے سے محمد اسماعیل پانی پتی رقم طراز ہیں:

"ہم اتنی روانی کے ساتھ نثر بھی نہیں لکھ سکتے, جس روانی کے ساتھ وہ اشعار تصنیف کیا کرتے تھے۔وہ شعر کہتے ہوئے سوچتے بالکل نہیں تھے, اُور نہ ہی انہیں دماغ پر زور دینا پڑتا تھا۔اُن کا دماغ گویا اشعار کی ایک مشین تھا, جس سے بڑی تیزی کے ساتھ اشعار نکلتے تھے۔"

(عہد ساز ادبی شخصیتیں, ص40)

المختصر کہ مولانا وحید الدین سلیم کا شمار ہریانہ کے ہی نہیں بلکہ اردو کے عظیم قلمکاروں میں ہوتا ہے۔آپ جدید لب و لہجے کے بہترین شاعر تھے۔حالانکہ انہوں نے ابتدائی دور میں رومانی شاعری ضرور کی لیکن جلد ہی موصوف کی رجحان جدیدیت کی طرف ہو گیا۔اس کے بعد کے دور کی شاعری اخلاقی اور اصلاحی قدروں قیمتوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔علاوہ ازیں آپ ایک بہترین نثر نگار بھی تھے۔ان کی نثری تخلیقات بہت معیاری اور اعلیٰ پائے کی ہیں۔اردو زبان کے ذخیرے میں اضافہ کیا اور اس زبان کو مالا مال کیا۔

☆☆☆

Ek Ahem Rubayi go: Ibrahim Ashq by Abdul Qahhar Anjum(research scholar ,Dept. of Urdu, Purniya University, Purniya)

ایک اہم رباعی گو: ابراہیم اشک

عبدالقہار انجم (ریسرچ اسکالر، پورنیہ یونیورسٹی، پورنیہ)

پوری اردو شاعری میں صنف رباعی کی روایت کبھی کمزور نہیں رہی، ہمارے بزرگ شعراء نے اپنی ہنرمندی سے اس صنف کو اوج کمال بخشا مگر جب کبھی رباعی کا غائر مطالعہ کیا جائے گا، فکر اور فن دونوں اعتبار سے تب ابراہیم اشک کی رباعیوں کا جوہر کھل کر سامنے آئے گا کہ انہوں نے فکری اعتبار سے اس کی وسعتوں میں کتنا اضافہ کیا اور فنی اعتبار سے کیا کمالات اور نمونے پیش کئے۔

یوں تو ابراہیم اشک نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی اور اپنی ایک الگ راہ بنانے کی سعی بھی کی اور اس حوالے سے انہوں نے اپنی انفرادیت کا احساس بھی کرایا، مگر تمام اضاف کے مقابلے ان کا اصلی جوہر رباعی میں ہی کھل کر سامنے آتا ہے۔ رباعی کی وسعتوں کا ذکر کریں تو بس یہ سمجھ لیں کہ عہد حاضر کا پورا منظر نامہ ان کی رباعیوں میں سمٹ آیا ہے۔ انہوں نے ادبی، سماجی، مذہبی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کے اہم تقاضوں کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ اپنی تخلیق کا حصہ بنایا اور ہزار رنگ جلوہ سامانیوں کو رباعی کے قلب میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی۔

فنی اعتبار سے رباعی کا جائزہ لیں تو ان کے تجربے اور فنی ریاضت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس طرح کے تجربے اردو شاعری میں خصوصاً رباعی میں دور دور تک نظر نہیں آتی۔ ان کی رباعی میں اختراعی عمل بھی سامنے آئے گا اور ہیئتی تجربے بھی۔ ہیئتی تجربے تو شاعری کی دوسری اضاف میں بھی ہوتے رہے ہیں، رباعی میں بھی ہوئے اس سے انکار نہیں، لیکن انہوں نے جو تجربے کئے وہ محض نام و نمود کے لئے نہیں ہیں، ہیئتوں میں کچھ الٹ پھیر کے لئے انہوں نے وہ تجربے نہیں کئے بلکہ اپنے تجربے کو اختراعی عمل سے گزارا ہے، بڑی محنت اور ریاضت کے بعد اپنے اختراع و تجربے کا نمونہ ادب کے حوالے کیا ہے۔ انہوں نے کئی نئی بحریں بھی ایجاد کیں۔ بحر کی نئی شکلیں 'لعلن' اور 'چہارن' کی شکل میں متعارف کرایا، انہوں نے بے نقطہ رباعیاں بھی کہی ہیں، صرف قافیہ ردیف سے ہی رباعی کے چاروں مصرعے کہنے کا ہنر بھی دکھایا ہے۔ کئی رباعیاں ایسی ہیں جس میں دو قافیوں اور دو ردیفوں کا برمحل استعمال کیا ہے۔ ارکان کے تکرار لفظی سے بھی انہوں نے کئی رباعیاں تخلیق کیں۔ انہوں نے

اللہ کے صفاتی نام کو مصرعوں میں لا کر نہ صرف رباعیاں کہیں بلکہ دو ہے بھی کہے۔ ایسے کئی تجربے اور اختراعی پہلو رباعی کے حوالے سے سامنے آتے ہیں، جس میں وہ حد درجہ کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی رباعی کا مطالعہ کریں تو کوئی بھی رباعی شعریت سے خالی نہیں ملے گی اور یہ شعریت ادق الفاظ سے نہیں بلکہ نہایت سادہ اور آسان، سیدھے سادے الفاظ سے پیدا کی گئی ہے۔

ان کی رباعی کا اختصاصی پہلو میری نظر میں یہ ہے کہ ان کے یہاں خود اعتمادی، خودداری اور بے باکی ہر جگہ موجود ہے۔ خود اعتمادی اس لئے کہ وہ فن کے ماہر ہیں اور فن پر عبور حاصل ہے۔ خودداری اس لئے کہ انہوں نے کبھی ضمیر سے سمجھوتہ نہیں کیا، ہمیشہ غلط کو غلط کہا اور بے باکی اس لئے کہ وہ اپنے تفکرات سے مطمئن ہیں، فکری بنیاد جس کی مضبوط ہوتی ہے، وہ اپنی بات بیباکی کے ساتھ اعلانیہ طور پر کہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ رباعی کے حوالے سے ابراہیم اشک کی جو خود اعتمادی اور تعلّی ہے وہ یونہی نہیں ہے، ان کے دعوے بھی کھوکھلے نہیں ہیں، بلکہ انہوں نے وہ ہنرمندی اور دانشوری اپنی تخلیقات میں پیش کرنے کی سعی کی ہے تو اس طرح کی رباعیاں وجود میں آئی ہیں بس ایک رباعی ملاحظہ فرمائیں:

گنجینہ معنی کا ہنر لایا ہوں افکار کا انداز دگر لایا ہوں
اے ظلمت تاریخ ادب تیرے لئے دامن میں رباعی کا سحر لایا ہوں

مذکورہ رباعی میں جو خود اعتمادی اور تعلّی کا عنصر ہے، وہ مطالعہ مشاہدہ اور تجربہ کی بنیاد پر ہے۔ فنی ریاضت سے یہ خود اعتمادی ان کے اندر پیدا ہوئی ہے باوجود اس کے کوئی زعم یا گھمنڈ نہیں، بردباری، خاکساری اشک کی سرشت میں شامل ہے۔ جس کا اظہار انہوں نے یوں کیا ہے:

کس بات پہ اتراتا پھرے ہے یہ مرد ہر سمت ہے دنیا میں بکھرا ہوا درد
پوچھے گا نہیں شہر خموشاں میں کوئی رہ جائے گی اڑتی ہوئی اپنی یہ گرد

ابراہیم اشک کی شاعری میں زندگی کی بھرپور ترجمانی ہوئی ہے، زمانے کا چہرہ آپ صاف صاف ان کی شاعری میں دیکھ سکتے ہیں۔ انہوں نے معاشرے کی آئینہ گری کی ہے اور عصری حسیت کے ایک ماہر نباض کی طرح نباضی کرتے ہوئے تخلیقی کام سرانجام دیا ہے۔ ان کی شاعری میں ذات اور کائنات، فرد اور سماج، مکاں اور لامکاں نیز ماضی و حال کی جس طرح توضیح و تشریح سامنے آئی ہے وہ ان کی فنی و فکری چابکدستی اور قادر الکلامی کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ دنیا کے ہر موضوع کو شعری پیکر عطا کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی رباعیات یا غزلیہ اشعار کا مطالعہ کریں تو ان کی تخلیقی

قوت وندرت کا اندازہ ہوگا کہ وہ نہایت سادہ، سلیس الفاظ کی بندش سے وہ کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جس کی سحر انگیزی سے نکلنا آسان نہیں ہوتا، دیر تلک اس سرور و کیف میں آدمی مبتلا رہتا ہے۔ اتنی وضاحت کے بعد یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اختراعی اور ہیئتی تجربوں کے حوالے سے چند رباعیاں پیش کروں تا کہ میری بات کی صداقت سامنے آسکے۔ غیر منقوط رباعی:

ہاں علم و عمل کا کام ہمارا ٹھہرا　　دکھ درد کا حل کام ہمارا ٹھہرا
احوال ہمارا ہے عالم عالم　　اس طور اٹل کام ہمارا ٹھہرا

دو قافیوں اور دو ردیفوں کی رباعی دیکھیں:

گھر چھوڑ کے فرزانے نکل جاتے ہیں　　در چھوڑ کے مستانے نکل جاتے ہیں
دنیا کے لئے دار و رسن پر اپنے　　سر چھوڑ کے دیوانے نکل جاتے ہیں

صرف قافیہ اور ردیف سے رباعی کا یہ انوکھا تجربہ دیکھیں:

سر درد محبت میں مزا دیتا ہے　　ہر درد محبت میں مزا دیتا ہے
یہ درد بری چیز ہے مانا ہم نے　　پر درد محبت میں مزا دیتا ہے

تکرار لفظی سے رباعی کا حسن دیکھیں:

انکار ہے اقرار ہے، تکرار ہے حسن　　سنگھار ہے، گلزار ہے ہلہار ہے حسن
دلدار ہے، فنکار ہے خوددار ہے عشق　　اس پار نہ اس پار ہے منجدھار ہے حسن

اس طرح کے اور بھی کئی نمونے پیش کئے جاسکتے ہیں، طوالت کے خوف سے اور ایک مضمون میں اتنی گنجائش بھی نہیں۔ انہوں نے حمدیہ، نعتیہ اور منقبت رباعیاں بھی کہی ہیں۔ اسماء الحسنیٰ کے حوالے سے ان کا پورا مجموعہ 'اللہ ہی اللہ' کے نام سے شائع ہوا۔ انہوں نے رباعی میں یہ کمال بھی کر دکھایا کہ صرف چھ رباعیات میں چوبیسوں اوزان کو پرونے کا کام کیا اور یہ کام وہی آدمی کر سکتا ہے جس کی عروض پر گرفت مضبوط ہو، تقطیع اور زحافات کے رموز سے نہ صرف واقف ہو بلکہ اس پر عبور بھی حاصل ہو۔ وہ جن بحروں کے موجد بنے یا جو بحریں انہوں نے ایجاد کیں، یہاں پر صرف ان کے نام پر اکتفا کرتے ہوئے اپنی بات ختم کرنا چاہوں گا۔ لعلن، چہارن، بحر بیکراں، بحر آئینہ اور بحر ہندو غیرہ، ان بحروں میں صرف ارکان یا ہیئت کی تشکیل و تعمیر میں زور صرف نہیں کیا بلکہ وہاں بھی اپنی شاعری کے وقار کو باقی رکھا اور فکری اعتبار سے بھی اسے وسعت دینے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔

☆☆☆

تمام زبانیں ہماری تہذیب و ثقافت کا حصہ ہیں : بنارس ہندو یونیورسٹی کے مہیلا مہا ودھیالیہ میں 'اردو بیت بازی' مقابلے میں پرنسپل پروفیسر ریتا سنگھ کا اظہار خیال (رپورٹ)

14/مارچ، بنارس ہندو یونیورسٹی کے مہیلا مہاودھیالیہ میں 'منتھن' کے بینر تلے آج اردو بیت بازی مقابلے کا انعقاد کیا گیا؛ جس میں بی اے فرسٹ ایر، سیکنڈ ایر اور تھرڈ ایر کی طالبات نے حصہ لیا۔ یہ مقابلہ تین گروپ میرؔ، غالبؔ اور فراقؔ میں مشتمل تھا۔ پروگرام کا آغاز مدن موہن مالویہ جی کے مجسمے پر گل پوشی کے ساتھ ہوا۔ مہیلا مہاودھیالہ کی پرنسپل پروفیسر ریتا سنگھ، شعبہ موسیقی سے رچا کمار اور بطور جج تشریف لائے شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر مشرف علی اور ڈاکٹر عبدالسمیع نے گل پوشی کی۔ اس کے بعد مہیلا مہاودھیالیہ کی پرنسپل نے پروفیسر ریتا سنگھ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ سبھی زبانیں ہماری تہذیب وثقافت کا حصہ ہیں۔ ان زبانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پھر اردو سیکشن کے انچارج ڈاکٹر افضل مصباحی نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے داغؔ کے مشہور شعر:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ ہندوستان میں دھوم ہماری زباں کی ہے

سے مقابلے کا باضابطہ آغاز کیا۔ اس مقابلے میں فراقؔ گروپ نے پہلا مقام حاصل کیا جبکہ میرؔ گروپ نے دوسرا مقام حاصل کیا۔ انفرادی طور پر ستاکشی نے پہلا مقام حاصل کیا۔ دوسرا مقام چترالی سریواستو اور تیسر مقام چنچل کماری نے حاصل کیا۔ اس کے بعد بطور جج تشریف لائے ڈاکٹر عبدالسمیع نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان میں سے چند طالبات نے ایسے خوبصورت انداز میں اشعار پیش کئے کہ اگر یہ مشاعرے میں جائیں تو مشاعرہ لوٹ لیں۔ اس موقع پر ڈاکٹر مشرف علی نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بیت بازی مقابلے میں حصہ لینے والی بیشتر طالبات کا تعلق اردو سے نہیں ہے، اس کے بعد انہوں نے اردو کے بہترین اشعار پیش کئے؛ جس کے لئے وہ سب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ پروگرام کے آخر میں مہیلا مہاودھیالیہ کے اساتذہ اور جج نے طالبات کے درمیان انعامات تقسیم کئے۔ شعبہ موسیقی سے تشریف لائیں پروفیسر ریچا کمار کے اظہار تشکر کے ساتھ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ مقابلے میں شریک طالبات کی تیاری کے ساتھ ساتھ پورے پروگرام کو کامیابی سے ہم کنار کرنے میں شعبہ اردو کے ریسرچ اسکالرز محمد اعظم، کمال الدین علی احمد، نسرین جہاں اور عائشہ پروین نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اس پروگرام میں مہیلا مہاودھیالیہ کے مختلف شعبوں سے تشریف لائے اساتذہ اور طلبا و طالبات نے شرکت فرما کر پروگرام کو زینت بخشی۔ بیت بازی کا یہ پروگرام کامیاب رہا۔ ☆☆☆